شعبان المعظم۔شوال المکرم ۱۴۳۲ھ
جولائی۔ستمبر ۲۰۱۱ء

سہ ماہی

حکمت قرآن

لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن

پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصّہ اول — سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن

صفحات: 360، قیمت 450 روپے (پانچواں ایڈیشن)

حصّہ دوم — سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ

صفحات 321، قیمت 400 روپے

حصّہ سوم — سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ

صفحات 331، قیمت 400 روپے

❁ عمدہ طباعت ❁ دیدہ زیب ٹائٹل اور مضبوط جلد ❁ امپورٹڈ پیپر

ملنے کے پتے

انجمن خُدّام القرآن خیبر بختونخوا، پشاور

A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار پشاور، فون: 2584824,2214495(091)

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرۃ: ۲۶۹)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۳۰ شمارہ ۳

شعبان المعظم۔شوال المکرّم ۱۴۳۲ھ جولائی۔ستمبر ۲۰۱۱ء

بیادگار:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم ــ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ

مدیر مسؤول: ڈاکٹر ابصار احمد

مُدیر: حافظ عاطف وحید

نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
حافظ محمد زبیر۔ حافظ نذیر احمد ہاشمی
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یکے از مطبوعات مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور۔فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل: publications@tanzeem.org

سالانہ زرِ تعاون: 200 روپے ، فی شمارہ: 50 روپے

اس شمارے میں

حرفِ اوّل		
فہمِ قرآن وشریعت کے دو انتہائی نقطہ ہائے نظر اور اعتدال	ڈاکٹر ابصار احمد	3
مضامین قرآن		
قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ	ڈاکٹر اسرار احمدؒ	7
فہمُ القرآن		
ترجمۂ قرآن مجید مع صرفی ونحوی تشریح	لطف الرحمٰن خان	17
حکمتِ نبویؐ		
رسول اللہ ﷺ کی رحم دلی	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	26
فکرِ فردا		
ڈاکٹر صاحبؒ کی یاد میں ایک گفتگو	جناب جاوید احمد	30
علومِ اسلامی		
فقہ اسلامی کا ارتقاء	محمد انس احسان	41
بحث و نظر		
قسطوں پر خرید وفروخت	حافظ نذیر احمد ہاشمی	53
تربیت و تزکیہ		
تکبر: ایک تجزیاتی مطالعہ	حافظ محمد زبیر	65
نقد و نظر		
ماں اور بیٹے کی محبت نفسیاتی ہے؟	مولانا عصمت اللہ	71
ایجاد و ابداعِ عالم		
THE PROCESS OF CREATION (iii)	Dr. Israr Ahmad	86
بیان القرآن		
MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

فہمِ قرآن وشریعت کے دو انتہائی نقطہ ہائے نظر اور اعتدال

قارئین اتفاق کریں گے کہ ''حکمتِ قرآن'' کا اجرا آغاز ہی سے اس بات کا علمبردار رہا ہے کہ قرآن حکیم نہ صرف مسلمانوں کے لیے (جو کلام اللہ کے آخری، مکمل اور محفوظ ہدایت ربانی ہونے پر یقین رکھتے ہیں) بلکہ تمام بنی نوعِ انسان کے لیے ہدایت و رہنمائی کا ابدی منبع اور سرچشمہ ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں سے متعلق اس کی تعلیمات راست بازی اور اعتدال و میانہ روی* کی اعلیٰ ترین مثالیں ہیں، جن کو اپنے رویّوں اور کردار میں اپنانے سے ہم اخلاقِ فاضلہ کی بلندیوں کو چھو کر دنیا و آخرت کی سعادتیں سمیٹ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان احکام کے ساتھ ساتھ قرآن کریم 'حکمت' سے بھی لبریز ہے اور اس کے حکم وعبر اس کے مندرجات میں جا بجا اصحابِ فکر ونظر کو دعوتِ تدبّر دیتے ہیں۔ چنانچہ جہاں قرآن فہمی اور اس سے اکتسابِ فیض کی ایک سطح 'تذکّر بالقرآن' کی ہے جس کے بارے میں بتکرار بیان کیا گیا ہے کہ وہ انتہائی آسان ہے، یعنی کتاب اللہ کی عمومی ہدایت ظاہر و باہر ہے اور اسے کوئی بھی متلاشیٔ حق آسانی سے پا سکتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح سطحِ آب پر آئی ہوئی مچھلیوں کا پکڑنا کچھ مشکل نہیں ہوتا، قرآن کے تذکّری پہلو تک رسائی بھی اسی طرح آسان وسہل ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿١٧﴾﴾ (القمر)

جبکہ دوسری طرف 'تدبّر بالقرآن' کا لیول نہ صرف محنت طلب اور مشکل ہے، یہ ایک اعتبار سے بہت سی احتیاطوں کا متقاضی ہے۔ تدبّر بالقرآن کا عمل اگر صحیح خطوط پر، تقویٰ اور تمسّک بالقرآن والسنّۃ کی سپرٹ کے ساتھ کیا جائے تو یقیناً بصیرتِ قرآنی، علمی تعمق اور وسعتِ نگاہ میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ بہت سے جدید اذہان کی تسلی و تشفی اسی طور پر ہو پاتی ہے اور قرآنی تعلیمات کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مطالعہ اور غور وفکر ایمان ویقین اور دینی جذبات میں اضافہ کر کے عمل پر ابھارتا ہے۔ اس مختصر سی تحریر میں حکمت و فلسفۂ قرآنی کے ضمن میں علم تفسیر یا اصول شریعت کے اہم اَبعاد و جہات کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ مقصود مختصراً قارئین کے سامنے یہ بات رکھنا ہے کہ بیسویں صدی کے اواخر اور اب اکیسویں صدی کے ایک دہائی

☆ میرے ذہن میں یہاں قدیم یونانی فلسفی ارسطو کی اخلاقیات کا بیان کردہ اصول 'Golden Mean' آتا ہے جسے ارسطو نے اخلاقی کردار و عمل کا اہم وصف قرار دیا تھا۔

گزرنے پر فہم قرآن اور مقاصدِ شریعت کی تفہیم کے سلسلے میں دو رویّے بہت نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ ایک رویّہ وہ ہے جو دین اور احکامِ شریعت کو اسی طرح سمجھنا چاہتا ہے جس طرح قرنِ اوّل کے مؤمنینِ صادقین نے سمجھا تھا اور اپنے عمل سے اس کی تعبیر پیش کی تھی۔ یعنی بالفاظِ دیگر دینی امور کے فہم میں تاریخ اور مرورِ زمانہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور ہمیں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کے قدموں تک لے جانا ہے۔ چنانچہ انجمن خدام القرآن کے صدر مؤسس برادر بزرگ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم و مغفور اپنی پچاس سالہ سے زائد قرآنی دعوت کی تگ و تاز میں یہی نکتہ شدّ و مد کے ساتھ پیش کرتے رہے۔ آپ اس سلسلے میں علامہ اقبال کا یہ شعر بھی سامعین کے جذباتِ ایمانی کی انگیخت کے لیے بہت زور دے کر پڑھتے تھے ؎

حرفِ او را ریب نے' تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

شارحِ قرآن (ﷺ) اور آپؐ کے صحابہ و تابعین یعنی 'متقدمین' کے حوالے سے دین کو سمجھنے والوں بالفاظِ دیگر قدامت پسندوں کے برخلاف 'متجددین' دورِ حاضر کا موقف یہ ہے کہ حالات کے موجودہ تناظر' ملٹی کلچرازم اور گلوبلائزیشن کے اس عہد میں مقاصدِ شریعت کی روشنی میں فقہ کی تشکیلِ نو اور تنظیمِ جدید کی ضرورت ہے۔ مابعد جدیدیت کے اصول علم اور تعبیر و تفہیم متن (Hermenutics) کی رو سے نہ صرف احادیث بلکہ قرآن کے احکام میں بھی تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ اور اس طرح یہ تجدد پسند حضرات اسلام کا ایک نیا ایڈیشن 'ریفارمسٹ اسلام' کے عنوان کے تحت پیش کر رہے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے علاوہ عالم عرب کے کئی ممالک سے تعلق رکھنے والے مسلم دانشور اور عقل گزیدہ حضرات اس متجددانہ فکر کی اپنی متعدد نگارشات میں توضیحات کر رہے ہیں اور اپنی آراء کے لیے استدلال کا عجیب و غریب تانا بانا قائم کرتے ہیں۔ مثلاً سوڈان کے پروفیسر عبداللہ النعیم' جو یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تدریسی فرائض سرانجام دے رہے ہیں' ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) سے شائع شدہ تازہ تصنیف بعنوان

Islam and the Secular State : Negotiating the Future of Sharia

میں سیکولر سٹیٹ کے حق میں دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ صرف سیکولر ریاست ہی میں کوئی شخص حقیقی معنی میں مسلمان ہو سکتا ہے۔ ان کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> *In order to be a Muslim by conviction and free choice, which is the only way one can be a Muslim, I need a secular state.*

پروفیسر النعیم کا مندرجہ بالا خیال عجیب منطق اور انتہائی انفرادیت پسندی کی سوچ پر مبنی ہے۔ وہ یہ جملہ لکھتے ہوئے فرد کی زندگی اور فکری رجحانات کی تشکیل میں اجتماعیات کی اہمیت سے بالکلیہ صرفِ نظر کر رہے ہیں'

اور غالباً انسان کو کسی تن تنہا خلائی مخلوق کے مماثل قرار دے رہے ہیں۔ عرب مسلم ممالک سے تعلق رکھنے والے اس فکر کے حامل متعدد حضرات مغربی دنیا کے استشراقی مراکز (جنہیں اب اسلامک سٹڈیز یا مسلم عیسائی تعلقات کے مراکز کا نام دیا جاتا ہے) میں اپنے متجددانہ فکر کی خوب تشہیر کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس میں انہیں اسلام مخالف اسلاموفوبیا میں مبتلا عالمی استعماری قوتوں کی حمایت و سرپرستی حاصل ہے۔ قرآن اور شریعت کے بارے میں اسی نوعیت کے خیالات و افکار رکھنے والے پروفیسر طارق رمضان ہیں' جن کی آج کل نہ صرف مغربی دنیا کی جامعات میں خوب پذیرائی ہو رہی ہے' گزشتہ برس انہیں ایک میموریل لیکچر کے لیے لاہور بھی بلایا گیا۔

مغربی افکار سے شدید متاثر مسلم سکالرز اور دانشوروں پر نقد و تبصرہ پر مشتمل ڈاکٹر احمد عبدالحمید غراب کی کتاب Subverting Islam - the Role of the Orientalist Centres صرف چشم کشا ہی نہیں' دلچسپ معلومات کا خزینہ بھی ہے۔ ڈاکٹر شیخ غراب کو اپنے افکار اور اس کتاب کے شائع کرنے پر کنگ سعود یونیورسٹی کی نہ صرف ملازمت سے نکال دیا گیا بلکہ سعودی عرب سے نکل جانے پر بھی مجبور کیا گیا اور ان کی یونیورسٹی میں زیر تعلیم دو بیٹیوں کو جامعہ سے خارج کر دیا گیا۔ ڈاکٹر غراب نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس طرح غیر مسلم صیہونی لابی کے پروفیسر حضرات مسلمان اساتذہ کے ذہن میں نہ صرف حدیث بلکہ قرآن کے بارے میں بھی شکوک و شبہات پیدا کر کے ان کے معتقدات کی تخریب کاری کا باعث بنتے ہیں' اور پھر وہ خود اس نقطۂ نظر کو اپنے تلامذہ میں منتقل کرتے ہیں۔

سطورِ بالا میں قدامت پسندی اور تجدد پسندی کی کشمکش کی ہلکی سی جھلک راقم نے دکھائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ پیکار ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ تیز سے تیز تر ہو رہی ہے۔ اس تناظر میں ہم پاکستان میں چھپنے والے دینی جرائد اور صحافت پر طائرانہ نظر ڈالیں تو یہ تقسیم ان میں بھی نظر آئے گی۔ بلکہ گوجرانوالہ کے ایک ہی دینی خانوادے میں فکری اختلاف ان کے رسالوں میں بہت نمایاں ہے' اور دو مختلف زاویہ ہائے نگاہ یا mindset ایک دوسرے سے بُعد المشرقین رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بہرحال یہ بھی حقیقت ہے کہ اُمت میں رائے کے اختلاف کو رحمت کہا گیا ہے بشرطیکہ یہ تشتّت و انتشار پر منتج نہ ہو۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے اپنے دروسِ قرآنی' لیکچرز اور شائع شدہ کتب و رسائل میں مذکورہ بالا دو انتہائی اور ایک دوسرے کے بالکل مخالف اور متضاد رویّوں کے درمیان راہِ اعتدال کی نشاندہی کی ہے۔ چنانچہ وہ جہاں ایک طرف کتاب و سُنّت سے تمسک اور اَسلاف پسندی کی طرف راغب کرتے ہیں' وہ ساتھ ہی مغربی اور سیکولر دنیا کی تہذیب و افکار کا ردّ حکمت قرآنی کی گہری بصیرت کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایمان کے مباحث کے ضمن میں بھی وہ اس ایمان کی افضلیت کے قائل ہیں جس میں تعمق' گہری

بصیرت اور علمی جہت مؤثر کردار ادا کر رہی ہو۔ اسی تناظر میں ڈاکٹر صاحب علامہ اقبال کی تشکیلِ جدیدِ الٰہیات اسلامیہ اور ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی مختلف تصانیف کا حوالہ دیتے ہوئے اس خیال کا اظہار کرتے تھے کہ ان دونوں محسنوں نے علمی کام کا صرف بلیو پرنٹ ہمارے سامنے رکھا ہے' جسے ہمیں آگے بڑھانا ہے۔ ان کے فکر میں اعتدال کا ایک اور مظہر یہ ہے کہ مغرب بالخصوص امریکی ریاست اور انتظامیہ نے جو ادارے (institutions) انتہائی عرق ریزی اور طویل جدّوجُہد کے بعد قائم کیے ہیں وہ کھلے دل کے ساتھ ان کی اہمیت وافادیت کے قائل ہیں۔ چنانچہ وہ ان کو ''نظامِ خلافت'' کے مجوزہ سٹرکچر میں بھی قائم رکھنے کا عندیہ دیتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ انتظامی ارتقاء جو جدید زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر بہت سے تجربات اور بحث وتمحیص سے گزر کر کیا گیا' پوری انسانیت کے فائدے اور استعمال کے لیے ہے' جبکہ ہمارے ہاں بعض متشدّدین (extremists) مغرب کی ہر شے کے رد کو عین تقاضائے دین سمجھتے ہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب مرحوم ومغفور نئے تہذیبی مسائل اور عالمگیریت کے تحت نوع بہ نوع معاملات ومسائل میں متعیّن اور مسلّمہ حدود اور قیود کے ساتھ اجتہاد کے حق میں بھی تھے' اگرچہ وہ ان تمام علمی کاوشوں کو احیائے اسلام کی کوششوں کے فریم ورک میں رکھ کر کرنا چاہتے تھے۔ عالمی سیاسی منظرنامے میں اَعداءِ اسلام بالخصوص یہود و ہنود کی ریشہ دوانیوں اور مسلم ممالک بشمول فلسطین' بوسنیا' عراق اور افغانستان پر ظلم وستم کا جتنا احساس انہیں تھا وہ ان کی تحریروں اور خطابات سے ظاہر ہے۔ نیز خالصتاً علمی سطح پر وہ ان مساعی کے بھی ناقد تھے جو اسلامیت اور جدیدیت کے درمیان مصالحت اور ہم آہنگی (compromise) کو فروغ دے کر مسلمانوں کو عصری تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کھلی چھوٹ دے دیتی ہیں۔ ان کے خیال میں مقاصد شریعت اور تدین کی جدید تشریحات اور تعبیرات بھی بہرحال ایک حقیقی مؤمن کی وہ 'غرابت' یا اجنبیت دور نہیں کر سکتیں جس کی صراحت خود نبی اکرم ﷺ نے اپنے دو اقوال مبارک میں کی ہے:

(i) كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ (بخاری و ترمذی)

(ii) بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ غَرِيْبًا كَمَا بَدَأَ' فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ (مسلم و ترمذی)

آخر میں قارئینِ حکمتِ قرآن سے درخواست گزار ہوں کہ وہ مرکزی انجمن خدام القرآن کے اس سہ ماہی جریدے کے ساتھ نہ صرف قلمی تعاون بڑھائیں' اس کے قارئین اور حلقہ خریداری کو بھی بڑھانے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں خاص طور پر جملہ وابستگانِ انجمن پر خصوصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

از: ڈاکٹر اسرار احمدؒ
ترتیب وتدوین: سید برہان علی۔ حافظ محمد زاہد

سُورۃُ الزُّخرف

سورۃ الزخرف چھوٹے چھوٹے سات رکوعوں پر مشتمل ہے۔ مضامین کے اعتبار سے یہ سورۂ مبارکہ اور سورۃ الدخان جوڑے کی شکل میں ہیں اور ان دونوں سورتوں کا آغاز ﴿حٰمٓ ① وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ②﴾ سے ہوتا ہے۔ سورۃ کے آغاز میں فرمایا:

﴿حٰمٓ ① وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ③﴾

''ح، م۔ قسم ہے اس کتاب کی جو بالکل واضح ہے اور ہم نے اسے قرآن عربی بنایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔''

یہاں یہ بات ذہن میں رکھیے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ لہٰذا جس طرح اللہ کی ذات کسی بھی پیمانہ میں آنے والی نہیں اسی طرح سے اس کی صفات بھی مطلق ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے اس ازلی کلام نے عربی قرآن کی شکل اختیار کی ہے جو ہمارے سامنے ہے۔ یہاں بڑے پیارے انداز میں بتایا جا رہا ہے کہ ہم نے بنایا ہے اس کو قرآن عربی تاکہ تم سمجھ سکو۔ چونکہ اس کے اوّلین مخاطب عرب ہی تھے اس لیے اس اعتبار سے تو بات بالکل واضح ہے کہ ان کو مخاطب کر کے بتایا جا رہا ہے کہ اس کو قرآن عربی اس لیے بنایا ہے تاکہ تمہارے اور اس کے مابین کوئی حجاب اور فصل نہ ہو۔ دوسری بات یہ کہ دنیا بھر کی زبانوں میں اپنی وسعت کے لحاظ سے عربی ہی وہ زبان ہے جو اللہ کے ابدی کلام کو اپنے دامن میں لے سکتی ہے اور یہی وہ زبان ہے جسے کما حقہ سمجھا جا سکتا ہے۔

اگلی آیت میں فرمایا: ﴿وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ④﴾ ''اور بے شک یہ قرآن ہمارے پاس اُم الکتاب (لوح محفوظ) میں بہت ہی عالی ترتیب وحکمت سے معمور ہے''۔ یہ قرآن مجید کی شان ہے کہ وہ لوحِ محفوظ میں محفوظ ہے اور وہیں سے یہ کلام بذریعہ وحیٔ الٰہی محمد ﷺ کے سینے پر اُترا ہے۔ ساتھ ہی فرما دیا گیا کہ کیا ہم تمہاری طرف سے یہ ذکر پھیر دیں گے اس وجہ سے کہ تم حد سے تجاوز کرنے والی قوم ہو؟ یعنی یہ واضح کر دیا گیا کہ تم لوگوں کی ہٹ دھرمیوں اور نادانیوں کی وجہ سے ایسے عظیم کلام کی تنزیل بند نہیں کی جا سکتی۔

آیات ۶ تا ۱۱ میں سابقہ انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں کو بیان کیا۔ اس کے بعد آیات ۱۲ تا ۱۴ میں ایک اہم مضمون بیان ہوا۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۙ﴿۱۲﴾ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۙ﴿۱۳﴾ وَاِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۴﴾﴾

''(اللہ وہ ذات ہے) جس نے سب چیز کے جوڑے بنائے اور بنائیں تمہارے لیے کشتیاں اور چوپائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔ تاکہ تم چڑھو اس کی پیٹھ پر اور اپنے ربّ کا احسان یاد کرو جب تم اس (سواری) پر (اچھی طرح) بیٹھ چکو تو یہ (دعا) پڑھو: پاک ہے وہ ذات جس نے اسے ہمارے لیے مسخّر کر دیا ورنہ ہم اسے قابو میں نہیں کر سکتے تھے' اور ہمیں اپنے ربّ ہی کی طرف لوٹ جانا ہے۔''

انسان ہاتھی جیسے جانور پر سواری کرتا ہے' اسی طرح گھوڑوں' اونٹوں' کشتیوں' بحری جہازوں اور ہوائی جہازوں پر سواری کرتا ہے تو اسے چاہیے کہ سوار ہوتے وقت یہ دعا ضرور پڑھ لے' کیونکہ اللہ ہی نے ان چیزوں کو انسان کے تابع کیا ہے ورنہ انسان ہاتھی جیسے جانور کو اپنے تابع کیسے کر سکتا ہے!

اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ انسان کے ناشکرے پن کا شکوہ کرتا ہے کہ انسان اس کی نعمتوں کا شکر کرنے کے بجائے اس کے لیے اولاد تجویز کرتا ہے اور وہ بھی بیٹیاں' حالانکہ انسان اپنے لیے بیٹیوں کے بجائے بیٹوں کو پسند کرتا ہے۔ فرمایا:

''اور ٹھہرائی ہے انہوں نے اللہ کے لیے اولاد اس کے بندوں میں سے۔ بے شک انسان کھلا ناشکرا ہے۔ کیا اللہ نے رکھ لیں اپنی مخلوقات میں سے بیٹیاں اور تم کو دے دیے چُن کر بیٹے؟ اور جب ان میں سے کسی کو خوشخبری دی جائے اس چیز کی جس کو انہوں نے رحمٰن کے نام لگایا (یعنی بیٹی) تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔ کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے اور جھگڑے کے وقت بات نہ کر سکے (اللہ کی بیٹی ہو سکتی ہے؟) اور انہوں نے فرشتوں کو جو اللہ کے بندے ہیں (اللہ کی) بیٹیاں مقرر کیا ہے۔ کیا یہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے؟ عنقریب ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور ان سے باز پرس کی جائے گی۔'' (آیات ۱۵ تا ۱۹)

اس سورہ کی آیات ۸۱ تا ۸۳ میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی زبان سے کفار کی اس بات کا جواب بایں الفاظ دیا ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِیْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۸۳﴾﴾

''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ اگر اللہ کی اولاد ہو تو میں سب سے پہلے (اس کی) عبادت کرنے والا ہوں۔ یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں آسمانوں' زمین اور عرش کا مالک اس سے پاک ہے۔ آپؐ ان کو فضول گوئی اور کھیل تماشے میں منہمک رہنے دیجیے یہاں تک کہ وہ دیکھ لیں اس دن کو جس کی ان کو دھمکی دی جاتی ہے۔''

آیات ۳۰ اور ۳۱ میں کفار کے قرآن حکیم پر کیے گئے دو اعتراضات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ اعتراضات

قرآن حکیم کے توسط سے درحقیقت نبی کریم ﷺ کی رسالت پر تھے۔ فرمایا:

﴿وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝﴾

''اور جب ان کے پاس حق آیا تو کہنے لگے کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو نہیں مانتے۔ اور (یہ بھی) کہنے لگے کہ یہ قرآن ان دونوں بستیوں (یعنی مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا؟''

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان اعتراضات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: ''کیا یہ لوگ آپ کے پروردگار کی رحمت کو بانٹتے ہیں؟ ہم نے ان کے مابین دنیوی زندگی کا سامانِ معیشت تقسیم کر دیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی تاکہ وہ ایک دوسرے سے خدمت لیں۔ آپ کے رب کی رحمت بہت بہتر ہے اس سے جو یہ جمع کرتے ہیں۔''

سورۃ الانعام میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ (آیت ۱۲۴) ''اللہ خوب جانتا ہے کہ (رسالت کا اہل کون ہے اور) کس کو اپنی پیغمبری عنایت فرمائے۔''

کفار کے پہلے اعتراض کہ یہ قرآن جادو ہے' کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ۝﴾ ''اور یہ (قرآن) آپؐ کے لیے اور آپؐ کی قوم کے لیے نصیحت ہے' اور تم لوگوں سے عنقریب (اس کے بارے میں) پوچھا جائے گا۔''

اس کے بعد یہ اہم مضمون بیان ہوا کہ ان لوگوں کی نگاہوں میں ساری اہمیت سیم و زر کی ہے جبکہ ہماری نگاہوں میں ان کی حیثیت مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں۔ فرمایا:

﴿وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ۝ وَزُخْرُفًا ۭ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾

''اگر یہ (اندیشہ) نہ ہوتا کہ تمام انسان ایک اُمت بن جائیں گے (یعنی کافر ہو جائیں گے اور ہم سے سبھی اپنا منہ موڑ لیں گے) تو جو لوگ رحمٰن کا انکار کرتے ہیں ہم ان کے گھر کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں (بھی) جن پر وہ چڑھتے۔ اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت بھی جن پر یہ تکیہ لگاتے ہیں۔ اور خوب تجمل (و آرائش کر دیتے' مگر یہ یاد رکھو کہ) یہ سب دنیا کی زندگی کا تھوڑا سا سامان ہے' اور آخرت (کی عیش و عشرت) آپؐ کے پروردگار کے ہاں پرہیزگاروں کے لیے ہے۔''

اس کے بعد آیت ۴۶ سے ۵۶ تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوا۔ اس تذکرہ میں یہاں ایک خاص بات آئی ہے اور وہ ہے شرک فی الملک یعنی بادشاہت میں شرک۔ بادشاہِ حقیقی صرف اللہ ہے' اس لیے جو کوئی بھی بااختیار یا بادشاہِ مطلق کا دعویٰ کرتا وہ درحقیقت خدائی کا دعوے دار ہے۔ فرعون نے بھی اپنی قوم میں یہی ندا لگائی: ﴿اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝﴾ ''کیا میرے لیے نہیں ہے مصر کی بادشاہی؟ اور یہ نہریں جو میرے (محلات کے) نیچے چل رہی ہیں (کیا میرے انتظام میں نہیں) کیا تم

دیکھتے نہیں؟'' پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے:

''بے شک میں اس شخص سے بہتر ہوں جس کی کوئی حیثیت نہیں اور جو صاف گفتگو بھی نہیں کر سکتا ہے۔[یہ بالکل وہی بات ہے جو کفار نے نبی کریم ﷺ کے لیے کہی تھی کہ یہ تو بے حیثیت ہے' اس کی جگہ کوئی بڑا شخص ہوتا تو ہم اس کی بات ضرور مانتے۔] تو اس پر سونے کے کنگن کیوں نہ اتارے گئے یا (یہ ہوتا کہ) فرشتے جمع ہو کر اس کے ساتھ آتے!''

یہ ہے شرک فی الملک' یعنی فرعون نے بادشاہِ مطلق کا دعویٰ کیا' جبکہ اللہ تعالیٰ کو یہ دعویٰ ناپسند اور غصہ دلانے والا ہے۔ اس پر اللہ نے اس سے اور اس کے پیروکاروں سے انتقام لیا اور ان سب کو غرق کر دیا۔

اگلی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر آیا اور اس تذکرہ میں یہ اہم بات بھی آئی: ﴿وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝۶۱﴾ ''اور وہ (عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کی نشانی ہیں' پس اس میں شک نہ کرو اور میرے پیچھے چلو۔ یہی سیدھا راستہ ہے''۔ جو حالات و واقعات قربِ قیامت میں پیش آنے والے ہیں ان میں سے ایک اہم واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہے۔ چنانچہ آپؑ کے ذکر کے آخر میں ارشاد ہوا:

''کیا یہ لوگ اب صرف اس بات کے منتظر ہیں کہ اچانک ان پر قیامت آ جائے اور ان کو خبر بھی نہ ہو!''

سُورۃُ الدُّخان

یہ سورۂ مبارکہ تین رکوعوں پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ سورۃ الزخرف کے آغاز میں ذکر ہوا کہ یہ دونوں سورتیں جوڑے کی حیثیت رکھتی ہیں اور دونوں کی ابتدا ﴿حٰمٓ ۝۱ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝۲﴾ کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ آگے ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝۳﴾ ''ہم نے اس کو نازل کیا ہے ایک مبارک رات میں (اور) ہم تو خبردار کرنے والے ہیں۔''

قرآن مجید میں اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ (الفاظ یا اسلوب کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ) ضرور آتے ہیں۔ اس طرح کا مضمون آخری پارہ میں سورۃ القدر میں دوبارہ آیا ہے۔ وہاں اس رات کو ''لیلۃ القدر'' کہا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱﴾ ''ہم نے اس کو نازل کیا لیلۃ القدر میں''۔ بعض لوگوں نے ناسمجھی کی وجہ سے ان کو دو راتیں سمجھ لیا ہے' حالانکہ یہ ایک ہی شب ہے جس کا ذکر دو جگہوں پر ہوا ہے۔ اس آیت میں اس کے نزول کی وجہ خبردار کرنا بتایا گیا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ کوئی بہادر شخص بے خبری میں حملہ نہیں کرتا بلکہ پہلے خبردار کرتا ہے اور پھر حملہ کرتا ہے' اس طرح اللہ تعالیٰ نے بھی کسی قوم پر اس وقت تک عذاب نہیں بھیجا جب تک کہ اپنے رسولوں کے ذریعے اُس قوم کو اچھی طرح خبردار نہ کر دیا ہو اور اُن پر حجت نہ قائم کر دی ہو۔ اگلی آیت میں اس رات کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝۴﴾ ''یہ وہ رات ہے کہ جس میں ہر اہم معاملے کا فیصلہ چکا دیا جاتا ہے''۔ یعنی جو بھی اہم معاملات ہیں وہ اس رات میں طے کیے جاتے ہیں' اس لیے اس رات میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا۔

سورۃ الزخرف میں قیامت کی ایک نشانی نزولِ عیسیٰ کا تذکرہ آیا تھا' اب اس سورہ کی آیت ۱۰' ۱۱ میں بھی

قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ''دخان'' یعنی ''دھواں'' کا تذکرہ ہے۔ فرمایا: ﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۝١٠ يَّغْشَى النَّاسَ ۭ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝١١﴾ ''تو اس دن کا انتظار کرو کہ جب آسمان سے صریح دھواں نکلے گا' جو لوگوں پر چھا جائے گا۔ یہ درد دینے والا عذاب ہے۔''

اگلی آیت میں نافرمانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ وہ اس نشانی کو دیکھ کر پکار اٹھیں گے: ''اے پروردگار! ہم سے اس عذاب کو دور کر دے' ہم ایمان لاتے ہیں'' (آیت ۱۲)۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اب ان کو نصیحت کہاں مفید ہوگی جبکہ ہمارے بھیجے ہوئے پیغمبر آ چکے جو کھول کھول کر بیان کرتے تھے۔ پھر انہوں نے اُن سے روگردانی کی اور کہنے لگے کہ یہ تو سکھلائے ہوئے یا جنّات کے سائے میں ہیں۔'' (آیات ۱۳۔۱۴)

اگلی آیات میں کفار کے لیے بطور امتثال فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوا کہ جیسے ہم نے تم تک اپنا پیغامِ ہدایت پہنچانے کے لیے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھیجا اسی طرح اس سے پہلے ہم نے اپنے پیغمبروں کو مختلف اقوام کی طرف بھیجا۔ پھر جس قوم نے نافرمانی کی تو ہم نے اسے عبرت کا نشان بنا دیا۔ ان میں سے ایک آلِ فرعون ہے جس کی طرف عالی قدر پیغمبر (موسیٰ علیہ السلام) کو بھیجا۔ انہوں نے اپنی قوم سے کہا: ﴿وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَي اللّٰهِ ۚ اِنِّىْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝١٩ وَاِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۝٢٠ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ ۝٢١﴾ ''اور اللہ کے سامنے سرکشی نہ کرو۔ بے شک میں تمہارے پاس کھلی دلیل لے کر آیا ہوں۔ اور اس بات سے کہ تم مجھے سنگسار کرو' میں اپنے اور تمہارے رب کی پناہ میں آتا ہوں۔ اور اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ سے دور ہو جاؤ''۔ اس کے بعد فرمایا کہ فرعون نے سرکشی کی تو اس کے جواب میں ہم نے اس کے پورے لشکر کو غرق کر دیا اور ان کو ذرا مہلت نہ دی۔

آیت ۳۴' ۳۵ میں فرمایا: ﴿اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ۝٣٤ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ۝٣٥﴾ ''یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف پہلی دفعہ مرنا ہے اور (پھر) اٹھنا نہیں''۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝٤٠﴾ ''بے شک فیصلے کا دن ان سب (کے اٹھنے کا) وقت ہے۔''

اگلی آیات میں سرکشوں اور اپنے پروردگار کا حکم نہ ماننے والے منکرین کے کھانے کا بیان ہے کہ زقوم (کڑوا ترین درخت) ان کا کھانا ہوگا اور تیل کی تلچھٹ جیسا کھولتا ہوا پانی ان کا پینا ہوگا اور پھر ان کے سروں پر گرم پانی ڈالا جائے گا اور کہا جائے گا: ''یہ وہی ہے جس میں تم لوگ شک کیا کرتے تھے۔'' (آیت ۵۰)

آیات ۵۱ سے ۵۷ تک جہنمیوں کے مقابلے میں اہلِ جنت اور ان کے انعامات کا تذکرہ ہے۔ یہ قرآن پاک کا اسلوب ہے کہ ایک چیز کو بیان کرنے کے بعد اس کی ضد کو بھی ساتھ ہی بیان کرتا ہے تاکہ فرق واضح ہو جائے۔ فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ۝٥١ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝٥٢﴾ ''بے شک پرہیزگار امن کی حالت میں ہوں گے (یعنی) باغوں اور چشموں میں''۔ مزید فرمایا کہ ان کا لباس خالص ریشم کا ہوگا' خوبصورت حوریں ہوں گی' ہر طرح کے میوے ہوں گے' اور یہ صرف ایک دفعہ ہی (دنیا میں) موت کا مزہ چکھیں گے' پھر ابدی حیات ہو گی جس میں مرنا نہیں ہو گا۔ آخر میں فرمایا: ﴿فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ

الْعَظِيْمُ﴿۵۷﴾ ''یہ تمہارے پروردگار کا فضل ہے۔یہی تو بڑی کامیابی ہے۔''اللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!

آیت ۵۸ میں فرمایا:﴿فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾﴾ ''(اے نبیﷺ!) ہم نے اس کتاب کو آپ کی زبان میں آسان بنادیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت پکڑیں''۔یعنی اس قرآن کو ہم نے عربی میں نازل کیا جو آپ کی مادری زبان ہے'اس لیے یہ آپ کی زبان سے بڑی سہولت کے ساتھ ادا ہوتا ہے۔اس کے یہ معنی بہرحال نہیں ہیں کہ اس کے مضامین میں گہرائی نہیں ہے۔اصل اعجاز تو ہوتا ہی ''سہل ممتنع'' میں کہ الفاظ تو آسان ہوں لیکن مضامین ایسے گہرے ہوں کہ تدبر کرنے کے لیے اس کی گہرائیوں میں اترا جائے۔قرآن بھی بعینہٖ اسی حیثیت کا مالک ہے۔اسی لیے تو امرءالقیس (جاہلی دور کا بڑا شاعر) اس کلام کو دیکھ کر دنگ رہ گیا اور کوئی بھی اس کے مثل کلام نہ لا سکا۔

سُورَۃُ الجَاثِیَۃ

یہ سورۂ مبارکہ چار رکوعوں پر مشتمل ہے۔مضامین کے اعتبار سے یہ سورۂ مبارکہ اور اس کے بعد آنے والی سورۃ الاحقاف جوڑے کی شکل میں ہیں اور ان دونوں سورتوں کا آغاز﴿حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ﴿۲﴾﴾ سے ہو رہا ہے۔اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کی سورۃ الدخان کے مضامین کے ساتھ بھی گہری مشابہت ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ سورۃ الدخان کے فوراً بعد یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔اس کا موضوع بھی توحید اور آخرت کے متعلق کفارِ مکہ کے اعتراضات کا جواب دینا اور ان کو ان کے اس رویہ پر متنبہ کرنا ہے جو انہوں نے قرآن کی دعوت کے مقابلے میں اختیار کر رکھا تھا۔سورۃ کے آغاز میں فرمایا:

﴿حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ﴿۲﴾﴾

''ح م۔اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو غالب اور دانا ہے۔''

آیات ۳ سے ۶ تک اللہ تعالیٰ نے توحید کے دلائل اور اپنی ان نشانیوں کا تذکرہ کیا ہے جس کا سب مشاہدہ کرتے ہیں۔فرمایا:

''بے شک آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں کے لیے (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں۔اور تمہاری پیدائش اور جانوروں میں بھی جن کو وہ پھیلاتا ہے'یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے جانے میں'اور وہ جو اللہ نے آسمان سے رزق نازل فرمایا پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ (بنجر) ہو جانے کے بعد زندہ کیا'اور ہواؤں کے بدلنے میں (بھی) عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔یہ اللہ (کی قدرت) کی نشانیاں ہیں جو ہم آپ کو سچائی کے ساتھ پڑھ کر سناتے ہیں۔تو یہ اللہ اور اس کی آیات کے بعد کس پر ایمان لائیں گے؟'' (آیات ۳ تا ۶)

اس طرح آیات ۱۲'۱۳ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانیوں اور بنی نوعِ انسان پر کیے گئے انعامات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

''اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو تمہارے قابو میں کر دیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر کرو۔اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ان سب کو تمہارے تابع کر دیا۔اس

میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔''

آگے ان نشانیوں کے باوجود اپنے کفر پر اڑے رہنے والوں کے دردناک انجام کا تذکرہ ہے۔ فرمایا: ﴿فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۸﴾ ''ایسے شخص کو دکھ دینے والے عذاب کی خوشخبری سنا دو'' —— ﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹﴾ ''ایسے لوگوں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے'' —— ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۰﴾ ''اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے'' —— ﴿لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝۱۱﴾ ''ان کو سخت قسم کا درد دینے والا عذاب ہوگا۔''

آیت ۱۵ میں اللہ تعالیٰ نے جزا و سزا کے حوالے سے ایک خاص اصول بیان کر دیا۔ فرمایا: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۗ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝۱۵﴾ ''جو کوئی نیک کام کرے گا تو اپنے لیے کرے گا اور جو بُرا کرے گا اس کا ضرر اسی کو ہوگا' پھر تم سب اپنے رب کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے''۔ یہاں یہ یاد رکھیں کہ آپ ایمان لائے یا کوئی نیک کام کر رہے ہیں تو یہ کسی پر احسان نہیں کر رہے۔ یہ عمل آپ اپنے لیے کر رہے ہیں۔

آگے آیات ۱۶ تا ۱۸ میں بنی اسرائیل کے حوالہ سے ارشاد ہو رہا ہے:

> ''ہم نے ان کو کتاب' حکمت اور نبوت عطا فرمائی اور ان کو عمدہ سامانِ زیست دیا اور دنیا بھر کے لوگوں پر ان کو فضیلت عطا فرمائی۔ دین کے معاملہ میں ان کو واضح ہدایات دیں' پھر علم آ جانے کے بعد ان کے درمیان آپس کی ضد کی وجہ سے اختلاف ہوا۔ قیامت کے دن اللہ ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے۔ (اے نبی ﷺ) ہم نے آپ کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ یعنی شریعت پر قائم کیا ہے لہٰذا آپ اسی پر چلتے رہیے اور ایسے لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کیجیے جو علم نہیں رکھتے۔''

تیسرے رکوع میں دہریت کا مضمون بتمام و کمال بیان ہوا ہے' فرمایا:

﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۗ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۗ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۲۳﴾

> ''کیا تم نے غور کیا اس شخص کے حال پر جس نے خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا اور اللہ نے اس کو اس کے تمام تر علم کے باوجود گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اللہ کے بعد اب کون ہے جو اس کو ہدایت دے؟ تو کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے؟''

اس بات کو اگر آج کے دور پر منطبق کر کے دیکھا جائے تو آج کل کیسا کیسا علم وجود میں آ چکا ہے اور سائنس و ٹیکنالوجی کس درجہ تک ترقی کر رہی ہے لیکن بجائے اس کے کہ اس علم کی ترقی سے لوگوں کی بصیرت میں اضافہ ہوتا وہ حقیقت سے دور سے دور تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

اگلی آیت میں دہریت کے اس مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا: ''اور کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے' ہم خود مرتے ہیں اور خود جیتے ہیں اور ہمیں ہلاک کرنے والی شے محض گردشِ ایام ہے۔ اور ان کو اس کا کچھ علم نہیں' یہ صرف گمان سے کام لیتے ہیں''۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ کائنات آپ سے آپ چل رہی ہے اور رواں دواں ہے۔ آپ سے آپ ہی چیزیں بن رہی ہیں اور ختم ہو رہی ہیں۔ ہم نہیں مانتے کہ اور

کوئی بالاتر ہستی یا طاقت ہے جس کا ارادہ یا مشیت یہاں کارفرما ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''(اے نبی ﷺ) کہہ دو اللہ ہی تم کو زندہ کرتا ہے پھر (وہی) تم کو موت دیتا ہے۔ پھر وہ تم کو قیامت کے روز' جس میں کوئی شک نہیں' جمع کرے گا۔ لیکن بہت سے لوگ اس کو نہیں جانتے۔'' (آیت ۲۶)

آیت ۳۲ میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے بارے میں کفار کا قول نقل کیا جو قیامت کو محض گمان خیال کرتے تھے۔ فرمایا: ''اور جب کہا جاتا کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کچھ شک نہیں تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہے' ہم اس کو محض گمان خیال کرتے ہیں اور ہمیں یقین نہیں آتا''۔ اگر ہم غور کریں تو اس وقت قیامت کے حوالے سے ہم میں سے اکثریت کا حال یہی ہے کہ ہم بھی آخرت کو ایک گمان سمجھتے ہیں کہ شاید ایسا ہو۔ اگر ہمارا دل آخرت اور قیامت کے قیام کے حوالے سے مطمئن ہو جائے تو اس سے ہماری زندگی میں عملی اعتبار سے ایک انقلاب عظیم برپا ہو جائے گا' لیکن یہ وہ چیز ہے جو آسانی سے ہاتھ آنے والی نہیں۔

آخری آیت میں اللہ تعالیٰ نے کبریائی اور بڑائی کو اپنے لیے مختص کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ ''اور آسمانوں اور زمین میں اسی (اللہ) کی بڑائی ہے۔ اور وہ غالب اور دانا ہے''۔ انسانوں کے لیے تکبر کسی صورت جائز نہیں ہے۔ ایک حدیث قدسی میں یہ الفاظ آتے ہیں: ''تکبر میری چادر ہے اور عظمت میرا لباس' جس نے مجھ سے ان میں سے کسی ایک پر جھگڑا کیا تو میں اسے جہنم میں پھینک دوں گا۔'' (ابوداؤد)

سُورۃُ الاَحقاف

یہ سورۂ مبارکہ چار رکوعوں پر مشتمل ہے اور یہ مضامین کے اعتبار سے سورۃ الجاثیہ کا جوڑا ہے۔ اس میں کفارِ مکہ کو ان گمراہیوں کے نتائج سے خبردار کیا گیا ہے جن میں نہ صرف وہ مبتلا تھے بلکہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اُن پر جمے ہوئے تھے اور الٹا اس شخص کو ہدفِ ملامت بنا رہے تھے جو انہیں ان گمراہیوں سے نکالنے کے لیے کوشاں تھا۔ قرآن کو اللہ کا کلام ماننے کے لیے تیار نہ تھے اور قیامت' حیات بعد الموت اور سزا و جزا کی باتوں کو ایک مَن گھڑت افسانہ سمجھتے تھے۔ آغازِ کلام ہو رہا ہے:

﴿حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝﴾

''ح' م۔ اس کتاب کا نزول ہے اس ہستی کی طرف سے جو العزیز اور الحکیم ہے۔''

یہ بالکل وہی الفاظ ہیں جن سے سورۃ الجاثیہ کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس سورۃ کی آیت ۹ ایک اہم آیت ہے جس میں فرمایا گیا:

﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِىْ مَا يُفْعَلُ بِىْ وَلَا بِكُمْ ۭ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَىَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾

''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ میں کوئی نیا نویلا رسول تو نہیں ہوں اور مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کل میرا کیا بنے گا اور تمہارا کیا بنے گا؟ میں تو اسی کی پیروی کر رہا ہوں (اور عمل کر رہا ہوں) کہ جو مجھ پر وحی کیا

جارہا ہے اور میں سوائے کھلے کھلے خبردار کر دینے والے کے اور کچھ نہیں۔''

یہ بڑی لرزا دینے والی آیت ہے۔ ایک تو اس سے لفظ بدعت کا مفہوم سمجھ میں آ جائے گا کہ بالکل نئی چیز جو پہلے سے نہ چلی آ رہی ہو بلکہ نئی ایجاد ہو' وہ بدعت کہلاتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ کہ نبی کریم ﷺ سے یہ کہلوایا جا رہا ہے کہ کہہ دو مجھے خود کچھ پتا نہیں ہے کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا اور تمہارے ساتھ کیا۔ انسان اس پر غور کرے تو یہ جملہ لرزہ طاری کر دینے والا ہے۔

آیت ۱۲ میں موسیٰ علیہ السلام اور ان پر نازل ہونے والی تورات کا تذکرہ کر کے فرمایا کہ یہ قرآن اس کا مصدِق (تصدیق کرنے والا) ہے۔ فرمایا:

﴿وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۲﴾

''اور اس قرآن سے پہلے موسیٰ کی کتاب (لوگوں کے لیے) امام تھی اور رحمت بھی۔ اور اب یہ عربی زبان میں نازل شدہ کتاب (یعنی قرآن) اس پہلی کتاب کی تصدیق کرتی ہوئی آئی ہے تاکہ ظالموں کو متنبہ کرے اور نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے دے۔''

آیت ۱۵ میں والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اور اس ضمن میں سلیم الفطرت انسان کا تذکرہ کیا ہے جو اللہ کے انعامات کا شکر بجالانے کے لیے اللہ سے توفیق کی بڑی بلیغ اور جامع دعا کرتا ہے' فرمایا:

''اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا۔ اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے باوجود پیٹ میں رکھا اور تکلیف سے ہی جنا۔ اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا اڑھائی برس میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب خوب جوان ہوتا اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں تیرا شکر بجالاؤں اس احسان کے بدلے جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیے اور (اس کی بھی توفیق دے) کہ میں نیک عمل کروں جس کو تو پسند کرے اور میرے لیے میری اولاد میں اصلاح کر۔ میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں فرمانبرداروں میں ہوں۔''

یہ الفاظ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا میں بھی آ چکے ہیں۔ یہاں والدین کے لیے بھی دعا ہو رہی ہے اور اولاد کے لیے بھی کہ میری اولاد بھی صالح بنے۔ اس لیے کہ اگر کسی نیک انسان کی اولاد صالح نہیں ہے تو وہ بجائے اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک بننے کے اس کے لیے مسلسل کوفت کا موجب بنی رہے گی۔

دوسری بات یہ کہ صالح اولاد سب سے بڑا صدقہ جاریہ ہے۔ انسان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کے اپنے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے لیکن اس کے حساب میں اس کی اولاد کے اعمالِ صالحہ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے سورۃ الفرقان میں اولاد کے لیے ایک دعا سکھلائی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝۷۴﴾

''اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔''

اس آیت میں یہ بھی فرمایا گیا کہ انسان چالیس سال کی عمر میں سنِ رُشد کو پہنچ جاتا ہے۔ اسی کو بنیاد بناتے ہوئے میں نے یہ تجویز کیا ہے کہ پاکستان کے سیاسی نظام میں ووٹر کی عمر بھی چالیس سال ہونی چاہیے تاکہ وہ پوری سمجھ داری سے اپنا رائے دہی کا حق استعمال کرے۔

آیت ۲۱ میں حضرت ہود علیہ السلام کا ذکر ہے جس میں حضرت ہود اور ان کی قوم کا معاملہ مذکور ہے۔ فرمایا: ''اور یاد کرو (قوم) عاد کے بھائی (ہود علیہ السلام) کو کہ جب انہوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں ہدایت کی —— اور تحقیق ان سے پہلے اور پیچھے بھی ہدایت کرنے والے گزر چکے ہیں —— کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو' مجھے تمہارے بارے میں بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔ کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم کو ہمارے معبودوں سے پھیر دو؟ لے آؤ وہ چیز (عذاب) جس سے ہمیں ڈراتے ہو اگر تم سچے ہو''۔ قوم کے انکار اور ہٹ دھرمی پر ان پر آندھی کا عذاب آیا اور اس نے اس قوم کو تہس نہس کر دیا۔

آیات ۲۹ تا ۳۲ میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کسی موقع پر وعظ فرما رہے تھے یا قرآن سنا رہے تھے تو جنات کے ایک گروہ کا وہاں سے گزر ہوا انہوں نے وہاں پر قرآن سنا جس کے نتیجہ میں ان کے اندر دعوت کا جذبہ اُبھرا اور انہوں نے اپنی قوم میں جا کر دعوت دی۔ فرمایا:

> ''اور جب ہم نے جنوں میں سے ایک جماعت تمہاری طرف متوجہ کی کہ قرآن سنیں' تو جب وہ اس کے پاس آئے (تو آپس میں) کہنے لگے کہ خاموش رہو۔ جب (پڑھنا اور سننا) تمام ہوا تو اپنی قوم میں واپس گئے تاکہ انہیں نصیحت کریں۔ کہنے لگے اے قوم ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے' جو (کتابیں) اس سے پہلے ہیں ان کی تصدیق کرتی ہے' سچ اور سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اے قوم! اللہ کی طرف بلانے والے کی بات قبول کرو اور اس پر ایمان لاؤ' اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں دکھ دینے والے عذاب سے دور رکھے گا۔ اور جو شخص اللہ کی طرف بلانے والے کی بات قبول نہ کرے تو وہ زمین میں (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکے گا اور نہ اس کے سوا اس کے حمایتی ہوں گے۔ یہ لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔''

ہمارے لیے یہ ایک مثال ہے کہ کوئی خیر اور نیکی کی بات اور نیک دعوت اللہ کے کسی بھی بندے کے سامنے آئے تو وہ اس کو قبول کرے اور اس کا علمبردار اور پرچارک بن جائے۔

اس سورۃ کی آخری آیت میں تشویق و ترغیب کے بڑے دلکش پیرائے میں نبی کریم ﷺ کو صبر کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

> ''(اے محمد ﷺ) صبر کیجیے جس طرح عالی ہمت پیغمبر صبر کرتے رہے ہیں اور ان کے لیے (عذاب) جلدی نہ مانگیے۔ جس دن یہ اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو (خیال کریں گے) گویا ہم (دنیا میں) صرف دن بھر ہی رہے۔ (یہ قرآن) پیغام ہے' پس اب نافرمان ہی ہلاک ہوں گے۔''

ترجمۂ قرآن مجید
مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم
ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ النساء
آیت ۲۵

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ط و ل

طَالَ ۔ يَطُوْلُ (ن) طَوْلًا :(۱) دراز ہونا' لمبا ہونا۔(۲) خیرات دینا۔ بخشش کرنا (یعنی دولت میں لمبا ہونا)۔ ﴿فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ﴾ (الحدید:۱۶) ''پھر دراز ہوئی ان پر مدت تو سخت ہو گئے ان کے دل۔''

طُوْلٌ (اسم ذات) :لمبائی۔ ﴿وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝۳۷﴾ (بنی اسراء یل) ''اور تو ہرگز نہیں پہنچے گا پہاڑ کو بلحاظ لمبائی کے۔''

طَوِيْلٌ (فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت): لمبا۔ ﴿اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝۷﴾ (المزمل) ''بے شک آپ کے لیے دن میں ایک لمبی مصروفیت ہے۔''

طَوْلٌ (اسم ذات): سخاوت' مال' دولت۔ ﴿شَدِيْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِي الطَّوْلِ ؕ﴾ (المؤمن:۳) ''سخت پکڑ والا' جُود وکرم والا۔'' ﴿اِسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ﴾ (التوبۃ:۸۶) ''اجازت چاہتے ہیں آپ سے دولت والے۔''

تَطَاوَلَ (تفاعل) تَطَاوُلًا : دور کی چیز کی طرف گردن بلند کر کے دیکھنا' لمبائی ظاہر کرنا۔ ﴿فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ﴾ (القصص:٤٥) ''پھر لمبائی ظاہر کی ان پر عمر نے۔''

ف ت ی

فَتِيَ ۔ يَفْتِيْ (س) فَتًى : نوجوان ہونا' خادم ہونا (زیادہ تر نوعمر لڑکے نوکر رکھے جاتے ہیں)۔

فَتًى تثنیہ فَتَيَانِ ج فِتْيَانٌ اور فِتْيَةٌ : نوجوان لڑکا' نوعمر خادم یا ملازم۔ ﴿قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ﴾ (الانبیاء) ''انہوں نے کہا کہ ہم نے سنا ایک نوجوان کو وہ ذکر کرتا ہے ان کا (یعنی بتوں کو برا کہتا ہے) جس کو کہا جاتا ہے ابراہیم''۔ ﴿وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ﴾ (یوسف:٣٦) ''اور داخل ہوئے اس کے ساتھ قید خانے میں دو نوجوان''۔ ﴿وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ﴾ (یوسف:٦٢) ''اور انہوںؑ نے کہا اپنے خادموں سے کہ تم لوگ رکھ دو ان کی پونجی''۔ ﴿اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ﴾ (الکہف:١٣) ''بے شک وہ لوگ کچھ نوجوان تھے جو ایمان لائے اپنے ربّ پر۔''

فَتَاةٌ ج فَتَيَاتٌ : نوجوان لڑکی' خادمہ' کنیز' آیت زیر مطالعہ۔

اَفْتٰى (افعال) اِفْتَاءً: مسئلے کا حل بتانا' فتویٰ دینا۔ (ذہنی صلاحیت کے لحاظ سے کسی کو نوجوان کرنا۔ علمی خدمت کرنا)۔ ﴿قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِى الْكَلٰلَةِ﴾ (النساء:١٧٦) ''آپؐ کہیے کہ اللہ بتاتا ہے تم کو کلالہ کے بارے میں۔''

اَفْتِ (فعل امر) : تو بتا' تو فتویٰ دے۔ ﴿اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ﴾ (یوسف:٤٦) ''تو بتا ہمیں سات موٹی گایوں کے بارے میں۔''

اِسْتَفْتٰى (استفعال) اِسْتِفْتَاءً : مسئلے کا حل پوچھنا' فتویٰ مانگنا۔ ﴿وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِى النِّسَاءِ﴾ (النساء:١٢٧) ''اور یہ لوگ پوچھتے ہیں آپؐ سے عورتوں کے بارے میں۔''

اِسْتَفْتِ (فعل امر) : تو پوچھ' تو فتویٰ مانگ۔ ﴿فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ﴾ (الصّٰفّٰت) ''تو آپؐ ان لوگوں سے پوچھیں: کیا آپؐ کے رب کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے؟''

خ د ن

ثلاثی مجرد سے نہیں آتا۔

خَادَنَ (مفاعلہ) مُخَادَنَةً : ایک دوسرے سے دوستی کرنا' یاری لگانا۔

خِدْنٌ ج اَخْدَانٌ : (مذکر و مؤنث دونوں کے لیے آتا ہے) دوست' یار' آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب: ''مَنْ'' شرطیہ ہے۔ ''طَوْلًا'' تمیز ہے ''يَسْتَطِعْ'' کی۔ ''فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ'' جواب شرط ہے اور ''مِنْ فَتَيٰتِكُمْ'' اس کا بدل ہے۔ ''اَعْلَمُ'' تفضیل کل ہے اور ''وَاللّٰهُ'' کی خبر ہے۔ ''مُحْصَنٰتٍ، غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ'' اور ''لَا مُتَّخِذٰتِ'' یہ سب حال ہیں۔ ''ذٰلِكَ'' کا اشارہ ''فَانْكِحُوْهُنَّ'' کی طرف ہے۔

ترجمہ:

وَمَنْ :اور جو
مِنْكُمْ :تم میں سے
اَنْ :کہ
الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ :مسلمان خاندانی عورتوں سے
مَلَكَتْ :مالک ہوئے
مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ: تمہاری مسلمان لونڈیوں میں سے
اَعْلَمُ :خوب جانتا ہے
بَعْضُكُمْ :تم میں کا کوئی
فَانْكِحُوْهُنَّ: پس تم لوگ نکاح کروان سے
وَاٰتُوْهُنَّ :اور تم لوگ دوان کو
بِالْمَعْرُوْفِ :بھلے طریقے سے
غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ :بدکاری نہ کرنے والیاں ہوتے ہوئے
فَاِذَآ :پس جب
فَاِنْ :پھر اگر
بِفَاحِشَةٍ :کوئی بے حیائی
نِصْفُ مَا :اس کا آدھا جو
مِنَ الْعَذَابِ :سزا میں سے
لِمَنْ :اس کے لیے ہے جو
الْعَنَتَ : مشکل میں پڑنے سے
وَاَنْ :اور (یہ) کہ
خَيْرٌ :(تو یہ) زیادہ بہتر ہے
وَاللّٰهُ :اور اللہ
رَّحِيْمٌ: ہر حال میں رحم کرنے والا ہے

لَّمْ يَسْتَطِعْ :صلاحیت نہیں رکھتا
طَوْلًا :بلحاظ دولت کے
يَّنْكِحَ :وہ نکاح کرے
فَمِنْ مَّا :تو وہ جن کے
اَيْمَانُكُمْ :تمہارے داہنے ہاتھ
وَاللّٰهُ :اور اللہ
بِاِيْمَانِكُمْ :تم لوگوں کے ایمان کو
مِّنْۢ بَعْضٍ :کسی سے ہے
بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ: ان کے مالکوں کی اجازت سے
اُجُوْرَهُنَّ :ان کے حق مہر
مُحْصَنٰتٍ :محفوظ کی ہوئیں ہوتے ہوئے
وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ :اور کچھ دوست نہ بنانے والیاں ہوتے ہوئے
اُحْصِنَّ :وہ محفوظ کردی جائیں
اَتَيْنَ :وہ کریں
فَعَلَيْهِنَّ :تو ان پر ہے
عَلَى الْمُحْصَنٰتِ :خاندانی خواتین پر ہے
ذٰلِكَ :وہ (یعنی کنیز سے شادی کرنا)
خَشِيَ :ڈرے
مِنْكُمْ :تم میں سے
تَصْبِرُوْا :تم لوگ صبر کرو
لَّكُمْ :تمہارے لیے
غَفُوْرٌ :بے انتہا بخشنے والا ہے

نوٹ: کوئی آزاد یعنی خاندانی شادی شدہ مرد یا عورت زنا کرے تو اس کی سزا رجم ہے۔ اگر کوئی غیر شادی شدہ یہی جرم کرے تو اس کی سزا ایک سو کوڑے ہیں۔ لیکن یہی جرم اگر کسی غلام یا کنیز سے ہوتا ہے' تو خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ' دونوں صورتوں میں اس کی سزا پچاس کوڑے ہیں۔

آیات ۲۶ تا ۲۸

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۖ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۝ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝

م ی ل

مَالَ۔ یَمِیْلُ (ض) مَیْلًا : درست سمت چھوڑ کر غلط سمت میں جھکنا۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ متعدد معانی میں آتا ہے۔ (۱) بھٹک جانا' آیت زیر مطالعہ۔ (۲) جھک جانا' ایک طرف کا ہو رہنا۔ ﴿فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ﴾ (النساء:۱۲۹) ''پس تم لوگ ایک کے مت ہو رہو کہ پھر تم چھوڑ دو دوسری بیوی کو لٹکائی ہوئی کی مانند۔'' (۳) کسی پر حملہ کرنا۔ ﴿فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ﴾ (النساء:۱۰۲) ''تو وہ لوگ حملہ کر دیں تم پر' یکبارگی حملہ کرتے ہوئے۔''

ترکیب: ''یَهْدِیَ'' اور ''یَتُوْبَ'' کی نصب بتا رہی ہے کہ یہ ''لِیُبَیِّنَ'' کی لام پر عطف ہیں۔ جبکہ ''سُنَنَ الَّذِیْنَ'' میں ''سُنَنَ'' کی نصب مفعول ہونے کی وجہ سے ہے جو ''یُبَیِّنَ'' اور ''یَهْدِیَ'' دونوں کا مفعول ہے۔ ''اَنْ یُّخَفِّفَ'' کا مفعول محذوف ہے جو ''اَلْعُثُوْرَ'' (دشواری) ہو سکتا ہے۔

ترجمہ:

یُرِیْدُ : چاہتا ہے	اللّٰہُ : اللہ
لِیُبَیِّنَ : کہ وہ خوب واضح کرے	لَکُمْ : تمہارے لیے
وَیَهْدِیَکُمْ : اور یہ کہ وہ ہدایت دے تم کو	سُنَنَ الَّذِیْنَ : ان (لوگوں) کے طریقوں کی جو
مِنْ قَبْلِکُمْ : تم سے پہلے (گزرے) ہیں	وَیَتُوْبَ عَلَیْکُمْ : اور یہ کہ وہ تمہاری توبہ قبول کرے
وَاللّٰہُ : اور اللہ	عَلِیْمٌ : جاننے والا ہے
حَکِیْمٌ : حکمت والا ہے	وَاللّٰہُ : اور اللہ
یُرِیْدُ : چاہتا ہے	اَنْ : کہ
یَتُوْبَ : وہ (رحمت کے ساتھ) متوجہ ہو	عَلَیْکُمْ : تم پر
وَیُرِیْدُ الَّذِیْنَ : اور چاہتے ہیں وہ لوگ جو	یَتَّبِعُوْنَ : پیروی کرتے ہیں

الشَّهَوٰتِ :خواہشات کی	اَنْ :کہ
تَمِيْلُوْا :تم لوگ بھٹک جاؤ	مَيْلًا عَظِيْمًا :بہت زیادہ بھٹکنا
يُرِيْدُ :چاہتا ہے	اللّٰهُ :اللہ
اَنْ :کہ	يُّخَفِّفَ :وہ ہلکا کرے (دشواری کو)
عَنْكُمْ :تم سے	وَخُلِقَ :اور پیدا کیا گیا
الْاِنْسَانُ :انسان کو	ضَعِيْفًا :کمزور

آیات ۲۹ تا ۳۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ وَاسْـَٔـلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝

ترکیب :''تَكُوْنَ'' کا اسم اس میں شامل ''هِيَ'' کی ضمیر ہے جو ''اَمْوَال'' کے لیے ہے۔ ''تِجَارَةً'' اس کی خبر ہے۔ ''يَفْعَلْ'' کا مفعول ''ذٰلِكَ'' ہے۔ ''عُدْوَانًا'' اور ''ظُلْمًا'' حال ہیں۔ ''نُدْخِلْ'' کا مفعول ''كُمْ'' کی ضمیر ہے۔ ''مُدْخَلًا'' ظرف ہے اور ''كَرِيْمًا'' اس کی صفت ہے۔ ''نَصِيْبٌ'' مبتدا موخر نکرہ ہے' اس کی خبر محذوف ہے اور ''لِلرِّجَالِ'' قائم مقام خبر مقدم ہے۔

ترجمہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ :اے لوگو جو	اٰمَنُوْا :ایمان لائے
لَا تَاْكُلُوْٓا :تم لوگ مت کھاؤ	اَمْوَالَكُمْ :تمہارے مال
بَيْنَكُمْ :آپس میں	بِالْبَاطِلِ :ناحق
اِلَّآ اَنْ :سوائے اس کے کہ	تَكُوْنَ :وہ ہو
تِجَارَةً :کوئی تجارت	عَنْ تَرَاضٍ :باہمی رضامندی سے
مِّنْكُمْ :تم لوگوں میں	وَلَا تَقْتُلُوْٓا :اور مت قتل کرو
اَنْفُسَكُمْ :اپنوں کو	اِنَّ اللّٰهَ :یقیناً اللہ
كَانَ :ہے	بِكُمْ :تم پر
رَحِيْمًا :رحم کرنے والا	وَمَنْ :اور جو

يَّفْعَلْ : کرے گا
ذٰلِكَ : یہ
عُدْوَانًا : زیادتی کرتے ہوئے
وَّ ظُلْمًا : اور ظلم کرتے ہوئے
فَسَوْفَ : تو عنقریب
نُصْلِيْهِ : ہم ڈالیں گے اس کو
نَارًا : ایک آگ میں
وَ كَانَ : اور ہے
ذٰلِكَ : یہ
عَلَى اللّٰهِ : اللہ پر
يَسِيْرًا : آسان
اِنْ : اگر
تَجْتَنِبُوْا : تم بچو
كَبَآئِرَ مَا : بڑوں سے اس کے
تُنْهَوْنَ : تم کو منع کیا گیا
عَنْهُ : جس سے
نُكَفِّرْ : تو ہم دور کر دیں گے
عَنْكُمْ : تم سے
سَيِّاٰتِكُمْ : تمہاری برائیوں کو
وَنُدْخِلْكُمْ : اور ہم داخل کریں گے تم کو
مُّدْخَلًا كَرِيْمًا : داخل کرنے کی باعزت جگہ میں
وَلَا تَتَمَنَّوْا : اور تم لوگ تمنا مت کرو
مَا : اس کی
فَضَّلَ : فضیلت دی
اللّٰهُ : اللہ نے
بِهٖ : جس سے
بَعْضَكُمْ : تمہارے کسی کو
عَلٰى بَعْضٍ : کسی پر
لِلرِّجَالِ : مردوں کے لیے
نَصِيْبٌ : ایک حصہ ہے
مِّمَّا : اس میں سے جو
اكْتَسَبُوْا : انہوں نے کمایا
وَلِلنِّسَآءِ : اور عورتوں کے لیے ہے
نَصِيْبٌ : ایک حصہ
مِّمَّا : اس میں سے جو
اكْتَسَبْنَ : انہوں نے کمایا
وَسْئَلُوا : اور تم لوگ مانگو
اللّٰهَ : اللہ سے
مِنْ فَضْلِهٖ : اس کے فضل میں سے
اِنَّ اللّٰهَ : یقیناً اللہ
كَانَ : ہے
بِكُلِّ شَيْءٍ : تمام چیزوں کو
عَلِيْمًا : جاننے والا

نوٹ 1: اردو میں ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص میرے پیسے کھا گیا' حالانکہ پیسہ کھایا نہیں جاتا۔ دراصل اس سے مراد یہ ہے کہ پیسے پر تصرّف حاصل کر لیا یا استعمال کر لیا۔ اسی طرح عربی میں لَا تَاْكُلُوْٓا کا مطلب ہے کہ تم لوگ تصرف مت کرو یا استعمال مت کرو۔ باطل یعنی ناحق میں وہ تمام طریقے شامل ہیں جو شرعاً ممنوع اور ناجائز ہیں۔ تجارت میں خرید و فروخت کے علاوہ ملازمت و مزدوری اور کرایہ کے معاملات بھی شامل ہیں۔ (معارف القرآن)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ سب سے زیادہ پاک کمائی تاجروں کی کمائی ہے' بشرطیکہ وہ جب بات کریں

تو جھوٹ نہ بولیں' اور جب وعدہ کریں تو وعدہ خلافی نہ کریں' اور جب ان کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت نہ کریں' اور جب کوئی سامان خریدیں تو اُس سامان کو (بلاوجہ) برا اور خراب نہ بتائیں' اور جب اپنا سامان فروخت کریں تو (خلافِ واقعہ) اس کی تعریف نہ کریں' اور ان کے ذمہ کسی کا قرض ہو تو ٹال مٹول نہ کریں اور جب ان کا قرض کسی کے ذمہ ہو تو اس کو تنگ نہ کریں۔ (منقول از معارف القرآن)

نوٹ ۲: ﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ پچھلے فقرے کا تتمہ بھی ہوسکتا ہے اور خود ایک مستقل فقرہ بھی۔ اگر پچھلے فقرے کا تتمہ سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھانا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے نظامِ تمدن خراب ہو جاتا ہے اور اس کے برے نتائج سے حرام خور آدمی خود بھی نہیں بچ سکتا' اور اس کی وجہ سے آخرت میں عذاب کا مستحق بن جاتا ہے۔ اور اگر اسے مستقل فقرہ سمجھا جائے تو اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ ایک دوسرے کو قتل مت کرو۔ دوسرے یہ کہ خودکشی مت کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے جامع الفاظ استعمال کیے ہیں اور ترتیبِ کلام ایسی رکھی ہے کہ اس سے یہ تینوں مفہوم نکلتے ہیں اور تینوں حق ہیں۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ ۳: کبیرہ گناہوں سے بچنے میں یہ بھی داخل ہے کہ تمام فرائض و واجبات کو ادا کرے' کیونکہ فرض اور واجب کا ترک کرنا خود ایک کبیرہ گناہ ہے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ جو شخص فرائض اور واجبات ادا کرتے ہوئے تمام کبیرہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچالے' تو اللہ تعالیٰ اس کے اعمالِ صالحہ کو صغیرہ گناہوں کا کفارہ کردیں گے۔

وضو کرنے سے' مسجد جاتے ہوئے ہر قدم پر' نماز اور دوسرے اعمالِ صالحہ سے گناہ معاف ہونے کا جو ذکر احادیث میں آتا ہے' ان سے مراد صغیرہ گناہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کبیرہ گناہ سچی توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے۔ (معارف القرآن)

نوٹ ٤: جن فضائل کی تمنا کرنے سے انسان کو اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے ان کا تعلق ایسی چیزوں سے ہے جن پر انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے اور جن میں انسان کی کوشش کا کوئی دخل نہیں ہے' مثلاً کسی کا مرد یا عورت ہونا' کسی خاندان میں پیدا ہونا' خوش شکل ہونا' خوش آواز ہونا' وغیرہ۔ یہ تقدیری معاملات ہیں' جبکہ کچھ فضائل انسان کے اختیار میں ہیں' جیسے علمی' عملی اور اخلاقی کمالات حاصل کرنا۔ ان کے لیے اسی آیت میں ارشاد فرمایا کہ مرد اور عورت دونوں کو ان کی کوشش میں سے ایک حصہ ملے گا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اپنی کم ہمتی اور بے عملی پر پردہ ڈالنے کے لیے تقدیر کا بہانہ بنانا غلط ہے۔ (معارف القرآن)

آیات ۳۳ تا ۳۵

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَي النِّسَاۗءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۭ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي

الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝
وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝

و ف ق

وَفَقَ ۔ يَفِقُ (ح) وَفْقًا : کسی چیز کا کسی کے ہم آہنگ ہونا' مطابق ہونا۔
اَوْفَقَ (مفاعلہ) وِفَاقًا: کسی کو کسی کے مطابق پانا۔﴿جَزَآءً وِّفَاقًا ۝﴾(النباء) ''بدلہ ہوتے ہوئے مطابق۔''
وَفَّقَ (تفعیل) تَوْفِيْقًا : کسی کو کسی کے ہم آہنگ یا مطابق کرنا' ہم آہنگی دینا' آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب: ''مَوْلٰی'' کی جمع ''مَوَالِی'' ہے۔ ''جَعَلْنَا'' کا مفعول ہونے کی وجہ سے یہ ''مَوَالِیًا'' تھا' پھر مضاف ہونے کی وجہ سے تنوین ختم ہوئی تو ''مَوَالِیَ'' استعمال ہوا۔ اس کا مضاف الیہ ''مِمَّا'' ہے۔ ''عَقَدَتْ'' کا مفعول ''الَّذِيْنَ'' ہے اور اس کا فاعل ''اَيْمَانُكُمْ'' ہے۔ ''فَالصّٰلِحٰتُ'' مبتدأ ہے۔ ''قٰنِتٰتٌ'' اور ''حٰفِظٰتٌ'' اس کی خبریں ہیں۔ ''خِفْتُمْ'' کا مفعول مرکب اضافی ''شِقَاقَ بَيْنِهِمَا'' ہے۔

ترجمہ:

وَلِكُلٍّ : اور سب کے لیے	جَعَلْنَا : ہم نے بنائے
مَوَالِيَ مِمَّا : وارث اس میں جو	تَرَكَ : چھوڑا
الْوَالِدٰنِ : والدین نے	وَالْاَقْرَبُوْنَ : اور قرابت داروں نے
وَالَّذِيْنَ : اور ان کو جن کو	عَقَدَتْ : باندھا
اَيْمَانُكُمْ : تمہاری قسموں نے	فَاٰتُوْهُمْ : تو تم لوگ دو ان کو
نَصِيْبَهُمْ : ان کا حصہ	اِنَّ اللّٰهَ : یقیناً اللہ
كَانَ : ہے	عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ : ہر چیز پر
شَهِيْدًا : گواہ	اَلرِّجَالُ : مرد
قَوَّامُوْنَ : ذمہ دار' کفیل ہیں	عَلَى النِّسَآءِ : عورتوں پر
بِمَا : بسبب اس کے جو	فَضَّلَ : فضیلت دی
اللّٰهُ : اللہ نے	بَعْضَهُمْ : ان کے کسی کو
عَلٰى بَعْضٍ : کسی پر	وَّبِمَآ : اور بسبب اس کے جو
اَنْفَقُوْا : انہوں نے خرچ کیا	مِنْ اَمْوَالِهِمْ : اپنے مال میں سے
فَالصّٰلِحٰتُ : پس نیک عورتیں	قٰنِتٰتٌ : فرمانبرداری کرنے والیاں ہیں
حٰفِظٰتٌ : حفاظت کرنے والیاں ہیں	لِّلْغَيْبِ : پیٹھ پیچھے
بِمَا : اس کی جس کی	حَفِظَ : حفاظت کی (یعنی چاہی)

اللّٰہُ :اللہ نے
تَخَافُوْنَ :تم لوگ خوف کرتے ہو
فَعِظُوْھُنَّ :تو نصیحت کروان کو
فِی الْمَضَاجِعِ :بستروں میں
فَاِنْ :پھر اگر
فَلَا تَبْغُوْا :تو مت تلاش کرو
سَبِیْلًا :کوئی الزام
کَانَ :ہے
کَبِیْرًا :بڑا
خِفْتُمْ :تمہیں خوف ہو
فَابْعَثُوْا :تو کھڑا کرو
مِّنْ اَھْلِہٖ :اس (مرد) کے گھر والوں سے
مِّنْ اَھْلِھَا :اس (عورت) کے گھر والوں سے
اِصْلَاحًا :اصلاح کرنے کا
اللّٰہُ :اللہ
اِنَّ اللّٰہَ :یقیناً اللہ
عَلِیْمًا :جاننے والا

وَالّٰتِیْ :اور جن عورتوں سے
نُشُوْزَھُنَّ :ان کی سرکشی کا
وَاھْجُرُوْھُنَّ :اور قطع تعلق کروان سے
وَاضْرِبُوْھُنَّ :اور ماروان کو
اَطَعْنَکُمْ :وہ اطاعت کریں تمہاری
عَلَیْھِنَّ :ان پر
اِنَّ اللّٰہَ :یقیناً اللہ
عَلِیًّا :بلند
وَاِنْ :اور اگر
شِقَاقَ بَیْنِھِمَا :ان دونوں کے درمیان باہمی مخالفت کا
حَکَمًا :ایک منصف
وَحَکَمًا :اور ایک منصف
اِنْ یُّرِیْدَآ :اگر وہ دونوں ارادہ کریں گے
یُّوَفِّقِ :تو مطابقت پیدا کرے گا
بَیْنَھُمَا :ان کے درمیان
کَانَ :ہے
خَبِیْرًا :باخبر

نوٹ :عرب میں رواج تھا کہ کچھ لوگ آپس میں باپ بیٹے اور بھائی بھائی کے رشتے قائم کر لیتے تھے۔اسی کے تحت رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ کرایا تھا۔اس رواج میں یہ بھی شامل تھا کہ مُنہ بولے رشتہ دار بھی حقیقی رشتہ داروں کے ساتھ ترکہ میں حصہ پاتے تھے۔آیت ۳۳ میں اسی کی ہدایت ہے کہ مُنہ بولے رشتہ داروں کو بھی ان کا حصہ دو۔بعد میں سورۃ الانفال کی آیت ۷۵ نازل ہونے سے یہ حکم منسوخ ہو گیا' کیونکہ یہ ایک عبوری حکم تھا۔اللہ تعالیٰ کے عبوری احکام کی حکمت اور ان کے اختتام کی وضاحت البقرۃ:۱۶۰ کے نوٹ ۱ میں کی جا چکی ہے۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

رسول اللہ ﷺ کی رحم دلی

مدرّس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ فَدَخَلَ [النَّبِیُّ ﷺ] حَائِطًا لِرَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ فَاِذَا جَمَلٌ فَلَمَّا رَاٰی النَّبِیَّ ﷺ حَنَّ وَ ذَرَفَتْ عَیْنَاهُ فَاَتَاهُ النَّبِیُّ ﷺ فَمَسَحَ ذِفْرَاهُ فَسَکَتَ، فَقَالَ: ((**مَنْ رَبُّ هٰذَا الْجَمَلِ؟ لِمَنْ هٰذَا الْجَمَلُ؟**)) فَجَاءَ فَتًی مِنَ الْاَنْصَارِ فَقَالَ لِیْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! فَقَالَ: ((**اَفَلَا تَتَّقِی اللّٰهَ فِیْ هٰذِهِ الْبَهِیْمَةِ الَّتِیْ مَلَّکَکَ اللّٰهُ اِیَّاهَا؟ فَاِنَّهٗ شَکَا اِلَیَّ اَنَّکَ تُجِیْعُهٗ وَتُدْئِبُهٗ**)) (سنن ابی داؤد)

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ ایک انصاری صحابی کے باغ میں تشریف لے گئے، وہاں ایک اونٹ تھا، جب اس اُونٹ نے آپ ﷺ کو دیکھا تو ایسا ڈکرایا اور ایسی درد بھری آواز نکالی جیسے بچے کے جدا ہونے پر اونٹنی کی آواز نکلتی ہے، اور اس کی آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ اس کے قریب تشریف لے گئے اور آپ ﷺ نے اس کی کنوتیوں پر اپنا دستِ شفقت پھیرا (جیسے کہ گھوڑے یا اونٹ پر پیار کرتے وقت ہاتھ پھیرا جاتا ہے) وہ اونٹ خاموش ہو گیا۔ پھر آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''یہ اونٹ کس کا ہے؟ اس کا مالک کون ہے؟'' ایک انصاری نوجوان آئے اور انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ اونٹ میرا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس بے چارے بے زبان جانور کے بارے میں تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں جس نے تم کو اس کا مالک بنایا ہے؟ اس نے مجھے شکایت کی ہے کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو، اور زیادہ کام لے کر تم اس کو بہت دکھ پہنچاتے ہو۔''

اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما بن ابی طالب ہیں۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں میں شامل تھے۔ حبشہ میں جب نجاشی نے مسلمانوں کے ساتھ مذاکرات کیے تو حضرت جعفرؓ نے ہی اسے سورۂ مریم کی آیات سنا کر مطمئن کیا۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ غزوۂ موتہ میں شریک ہوئے اور لشکرِ اسلام کے عَلَم بردار مقرر ہوئے۔ جنگ کے دوران ان کے دونوں بازو کٹ گئے اور وہ شہید ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بازوؤں کے بدلے میں جنت میں انہیں دو پَر عطا فرما دیے ہیں اور وہ جنت میں اڑتے پھرتے ہیں۔ چنانچہ انہیں جعفر طیار اور ذوالجناحین بھی کہا جاتا ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ انہی کے بیٹے ہیں۔ والدہ کی طرف سے حضرت عبداللہ، محمد بن ابی بکر کے بھائی تھے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بڑے فیاض تھے اور ان کا اعزازی لقب ''بحر الجود'' (سخاوت کا دریا) تھا۔

اس حدیث میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے تو وہاں ایک اونٹ

تھا جس نے آپؐ کو دیکھ کر دردناک آواز نکالی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ گویا اس نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی تکلیف سے آگاہ کرنا چاہا۔ رحمۃ للعالمین ﷺ اس اونٹ کے پاس گئے' اس کی کنپٹیوں پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر دریافت فرمایا کہ اس اونٹ کا مالک کون ہے؟ جب اس کا مالک آپ ﷺ کے پاس آیا تو آپؐ نے اسے فرمایا کہ تم اس بے زبان جانور کے بارے میں اللہ سے نہیں ڈرتے؟ اس نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اسے بھوکا رکھتے ہو اور کام بھی اس کی طاقت سے زیادہ لیتے ہو۔

رسول اللہ ﷺ دین کامل لے کر آئے تھے' جس میں حقوق و فرائض کی پوری وضاحت موجود ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کسی بھی ذی روح کو تکلیف نہ پہنچاؤ' بلکہ اگر کسی کو تکلیف میں دیکھو تو اس کی تکلیف دور کرنے کی کوشش کرو' خواہ وہ انسان ہو یا حیوان۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰہِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عِیَالِہٖ)) (رواہ البیہقی فی شعب الایمان) ''ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے' پس مخلوق میں سے اللہ کا محبوب ترین بندہ وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ اچھا سلوک کرے''۔ گویا مخلوق کے ہر فرد کے ساتھ حسنِ سلوک اور نرمی کا برتاؤ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے' خواہ وہ انسان ہو یا حیوان۔ ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی کہا گیا ہے اور مسلمان کی شان یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو ہاتھ اور زبان سے کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچائے' بلکہ بھائی ہونے کا تقاضا پورا کرتے ہوئے ہر دوسرے مسلمان کا ہمدرد اور خیر خواہ ہو۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لیے وہی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے (صحیحین)۔ مؤمن تو مؤمن ہے' اسلام تو پُرامن کافروں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ کسی بھی جاندار کو تکلیف پہنچانا بڑا گناہ اور ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوق کو اپنا کُنبہ کہا ہے۔ جس طرح سربراہ خاندان کو اپنے افرادِ خانہ سے محبت ہوتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے ہر فرد کے ساتھ محبت ہے۔ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ جانوروں کو تنگ کرنے سے منع کیا گیا ہے' پالتو جانوروں سے ان کی طاقت کے مطابق کام لینے اور پوری غذا دینے کی تاکید کی گئی ہے۔

اس حدیث میں مذکور اونٹ کا مالک اسے کم خوراک دیتا' بھوکا رکھتا اور کام اس کی طاقت سے زیادہ لیتا تھا۔ چنانچہ اس نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات کی شکایت کی اور رسول اللہ ﷺ نے اس کے مالک کو خوفِ خدا کا احساس دلایا اور اس جانور کے معاملے میں اسے نصیحت کی کہ اسے پوری خوراک دیا کرے اور کام بھی مناسب لے۔

یہاں ایک اور بات بھی معلوم ہوتی ہے' وہ یہ کہ اس اونٹ نے رسول اللہ ﷺ کو پہچان لیا اور اُن کے پاس اپنی تکلیف کی شکایت کی۔ کتنے ہی بڑے چھوٹے لوگ اس اونٹ کے پاس سے گزرتے ہوں گے' اسے دیکھتے ہوں گے' مگر اس نے کسی اور سے شکایت نہیں کی بلکہ اس ہستی کو اپنی شکایت سنائی جہاں اس کا شکایت کرنا سودمند تھا۔ چنانچہ اس کے مالک کو آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں مناسب تنبیہ کر دی۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آپ ﷺ کے اوّلین مخاطب انسان آپ کو نہ پہچان سکے اور بجائے اس کے کہ آپؐ کی دعوت پر لبیک کہتے اُلٹے آپؐ کی مخالفت کرنے اور اذیت دینے میں حد کر دی' مگر حقیقت یہ ہے کہ ابوجہل' ابولہب اور دوسرے سردارانِ قریش آپ ﷺ کو اچھی طرح پہچانتے تھے مگر بدقسمت تھے کہ تعصب نے ان کو اندھا کر رکھا تھا' ورنہ قرآن میں

ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے۔ گویا جن لوگوں نے آپؐ کو دیکھا اور اسلام نہ لائے ان کے مفادات آڑے آئے اور وہ اپنے آباء واجداد کے باطل طریقوں کو چھوڑنے کی ہمت نہ کر سکے۔ اس کے برعکس یہ اونٹ کتنا بخت آور ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود چند قدم چل کر اس کے پاس گئے اور اس کی کنپٹیوں پر ہاتھ پھیرا اور اس کی شکایت سنی۔

جانوروں کے ساتھ رحم دلی کا سلوک کرنے کی رسول اللہ ﷺ نے بہت تاکید فرمائی ہے۔ اس سلسلہ میں کتب حدیث میں کئی واقعات ملتے ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن اپنے والد ماجد سے روایت کرتے ہیں:

''ایک سفر میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے' آپؐ قضاءِ حاجت کے لیے تشریف لے گئے' اس اثنا میں ہماری نظر ایک سرخ چڑیا (غالباً نیل کنٹھ) پر پڑی' جس کے ساتھ اس کے چھوٹے چھوٹے دو بچے بھی تھے۔ ہم نے ان بچوں کو پکڑ لیا' وہ چڑیا آئی اور ہمارے سروں پر منڈلانے لگی۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے۔ آپؐ نے فرمایا: ''کس نے اس کے بچے پکڑ کے اسے ستایا ہے؟ اس کے بچے اس کو واپس کر دو'' —— اور آپؐ نے چیونٹیوں کی ایک بستی دیکھی (یعنی زمین کا ایک ایسا ٹکڑا جہاں چیونٹیوں کے بہت سوراخ تھے اور چیونٹیوں کی بہت کثرت تھی) ہم نے وہاں آگ لگا دی تھی' آپؐ نے فرمایا: ''کس نے ان کو آگ سے جلایا ہے؟'' ہم نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! ہم نے ہی آگ لگائی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''آگ کے پیدا کرنے والے رب کے سوا کسی کے لیے یہ سزاوار نہیں ہے کہ وہ کسی جاندار کو آگ کا عذاب دے۔'' (سنن ابی داؤد)

حلال جانوروں کو ذبح کر کے اُن کا گوشت کھانے کا حکم ہے کہ وہ اسی لیے پیدا کیے گئے ہیں' مگر ان کو بھوکا پیاسا رکھنا' انہیں مارنا پیٹنا اور ضرورت سے زیادہ کام لینا گناہ کی بات ہے۔ مسلمان کو ہدایت ہے کہ جب وہ جانور کو ذبح کرے تو چھری کو خوب تیز کر لے تاکہ جانور کو کم سے کم تکلیف ہو۔ پھر ذبح کرنے سے پہلے اُسے بھوکا پیاسا نہ رکھے بلکہ اسے پانی اور چارہ مہیا کرتا رہے۔ اس کی کھال اُس وقت اُتارنا شروع کرے جب وہ پوری طرح بے حس وحرکت ہو جائے۔ اسی طرح کسی زندہ جانور کے سامنے دوسرے جانور کو ذبح بھی نہ کرے۔

لوگ جانوروں کے حقوق کو عام طور پر کوئی اہمیت نہیں دیتے' حالانکہ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے اور جانوروں پر ظلم کرنا اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ ایک عورت بلّی کو بھوکا پیاسا رکھنے کی پاداش میں جہنّم کا ایندھن بن گئی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا: ''ایک بے درد اور بے رحم عورت اس لیے جہنم میں گرائی گئی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ کر (بھوکا مار ڈالا) نہ تو اُسے خود کچھ کھانے کو دیا اور نہ اسے چھوڑا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑوں سے اپنی غذا حاصل کر لیتی۔'' (بخاری ومسلم)

یہ بنی اسرائیل کی ایک عورت تھی جس کا حال اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر منکشف فرما دیا۔ اسی طرح ایسا بھی ہوا کہ ایک شخص نے کسی جانور پر رحم کھایا اور بھوک اور پیاس میں کھانا پانی دیا یا اس کے دکھ درد کو محسوس کیا اور اس کی مدد کی تو اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کی خطاؤں کو معاف کر دیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول

اللہﷺ نے فرمایا:

''اس اثنا میں کہ ایک آدمی راستہ چلا جا رہا تھا' اسے سخت پیاس لگی۔ چلتے چلتے اسے ایک کنواں ملا' وہ اس کے اندر اترا اور پانی پی کر باہر نکل آیا۔ کنوئیں کے اندر سے نکل کر اس نے دیکھا کہ ایک کُتا ہے جس کی زبان باہر نکلی ہوئی ہے اور پیاس کی شدت سے وہ کیچڑ کھا رہا ہے۔ اُس آدمی نے دل میں کہا کہ اس کتے کو بھی پیاس کی ایسی ہی تکلیف ہے جیسی کہ مجھے تھی۔ چنانچہ وہ اس کتے پر رحم کھا کر پھر اس کنوئیں میں اترا اور اپنے چمڑے کے موزے میں پانی بھر کر اُس نے اس کو اپنے مُنہ سے تھاما اور کنوئیں سے باہر نکل آیا اور اس کتے کو وہ پانی اس نے پلا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی رحم دلی اور اس محنت کی قدر فرمائی اور اسی عمل پر اس کی بخشش کا فیصلہ فرما دیا۔ بعض صحابہؓ نے حضورﷺ سے یہ واقعہ سن کر دریافت کیا یا رسول اللہ! کیا جانوروں کی تکلیف دور کرنے میں بھی ہمارے لیے اجر و ثواب ہے؟ آپﷺ نے فرمایا: ''ہاں! ہر زندہ اور تر جگر رکھنے والے جانور (کی تکلیف دور کرنے) میں ثواب ہے۔'' (بخاری و مسلم)

یہ جذبۂ ترحم اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ خود ارحم الراحمین ہے اور اسے رحم دل لوگ پسند ہیں۔ رسول اللہﷺ فرماتے ہیں: ''رحم کرنے والوں اور ترس کھانے والوں پر بڑی رحمت کرنے والا (اللہ تعالیٰ) رحم کرے گا۔ زمین پر رہنے بسنے والی اللہ کی مخلوق پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔'' (جامع ترمذی' سنن ابی داؤد) اسی مضمون کو شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ؎

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر — خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر!

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف

☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن

☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات

☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ

☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم

☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے

☆ اردو اور انگریزی کتابیں

☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں ایک گفتگو

''اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام''

پر جناب احمد جاوید کا اظہارِ خیال

علمِ نفسیات کی نظری اور عملی تشکیل سے بہت پہلے، مسلمانوں کے اندر ان کے دین سے وابستگی کے مزاج نے شخصیت کے بارے میں ایک ایسا تصور مسلّمات کے درجے میں لاکر رائج کر دیا تھا، جس کا ابتدائی خاکہ بنانے ہی میں نفسیات کی روایت کے کئی ادوار گزر گئے، اور اس علم کے کئی دبستان نارسائی کے غبار میں گم ہو گئے۔ انسانی شخصیت نظریات سے تشکیل نہیں پاتی، بلکہ اس کی تعمیر میں سب سے زیادہ ہاتھ ارادے اور میلانات کا ہوتا ہے۔ ارادہ شعور کے مستقل احوال کو نتیجہ خیز اعمال میں ڈھالنے کا کام کرتا ہے اور آدمی کے قلبی اور طبعی میلانات، جو ارادے کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں، شعور میں رائج تصوّرات کے ساتھ تعلق کو ایک ایسی ساخت مہیا کرتے ہیں جو نہ صرف ذہنی ہے اور نہ فقط ارادی، بلکہ نفس کے زیادہ گہرے محرکات سے بنتی ہے۔ ان محرکات کو اگر فطرت کے نظامِ اقتضاء کے بنیادی عناصر قرار دیا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ اسلام نے طولِ تاریخ میں کمالِ انسانی کے جو لاتعداد شخصی مظاہر پیدا کیے ہیں ان میں، تنوع کی کارفرمائی کے باوجود، یہ وحدت اور اشتراک بہرحال نظر آتا ہے کہ تمام دین دار آدمیوں کی شخصیتیں ارادے اور طبیعت کی مستقل اَقدار پر استوار ہوتی ہیں۔ شخصیتوں کے مابین تنوع کی اساس بڑی حد تک ذہنی ہوتی ہے، مگر وجود کی ایمانی ماہیت میں طبیعت اور ارادے کی اندرونی کارفرمائی ہو یا ان کا عملی اظہار، دونوں سطحوں پر ایک ہمہ گیر وحدت برسرِ کار دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں شخصیت کے دینی قوام میں ذہن کی حیثیت ثانوی ہے، فضائل و کمال کے اکثر معیارات طبعی اور عملی ہیں۔ لیکن چونکہ ذہن شخصیت میں وسعت پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لہٰذا جن حضرات میں یہ طبیعت اور ارادے کے ساتھ ہم قدم بلکہ ہم حال ہو جاتا ہے وہ لوگ امت کے بہترین افراد ہوا کرتے ہیں۔ انہی کو تکمیلِ شخصیت کی وہ قوت میسّر آتی ہے جہاں ذہن حقائق سے اتنا مانوس ہو جاتا ہے کہ علم اور حال، اور تصور اور عمل میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ ذہن، ارادے اور طبیعت کی ایسی روبہ کمال یکجائی ان تینوں کا سب سے قیمتی حاصل بھی ہے اور مقصود بھی۔ میں نے اللہ کے فضل سے اس درجہ کمال پر پہنچی ہوئی کچھ شخصیتیں دیکھی ہیں، ان میں سے ہر ایک ایسا صاحب حضور تھا کہ اسے دیکھتے ہی یہ احساس ہو جاتا تھا کہ انسان کی پوری شخصیت ایک ہی سرچشمے سے کیسے سیراب ہوتی ہے۔ ان کا خیال ہو یا عمل، جذبات ہوں یا احساسات، سب کے سب ایک ہی قوت سے نمو پاتے تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان ہی شخصیات میں سے ایک تھے۔

مجھے ڈاکٹر صاحب سے زیادہ قرب تو نصیب نہیں رہا' چند ہی ملاقاتیں رہیں' لیکن ان کے اندر ایک وفورِ وجود تھا' جس کا پہلا مشاہدہ یا تجربہ ہی اتنا مکمل ہوتا تھا کہ بار بار ملنے سے بھی اس پر کوئی اضافہ ممکن نہیں لگتا تھا۔ میں نے اپنے استاد اور محسن مولانا محمد ایوب صاحب دہلویؒ کے بعد ڈاکٹر صاحب کو دیکھا کہ ان سے مل کر تمام جہاتِ تعلق روشن ہو جاتی تھیں۔ آدمی ایک نظامِ تعلقات کا حصہ ہے' اس کے لیے ہر تعلق کچھ مخصوص تاثرات کا حامل ہوتا ہے۔ مثلاً دوستی' رشتہ داری' خوردی و بزرگی' یا پھر انتہائی حد پر جا کر دیکھئے تو تعلق کی روحانی اقلیمیں' مثلاً اللہ سے تعلق' اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ تعلق' اللہ کی کتاب کے ساتھ تعلق' دین سے تعلق وغیرہ۔ ان میں سے ہر علاقہ اور ہر نسبت ایک خاص کیفیت رکھتی ہے' جو ذہن میں الگ الگ تصورات تشکیل دیتی ہے' عمل کو مخصوص محرکات فراہم کرتی ہے اور طبیعت میں خاص خاص جذبات و احساسات پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے ہر تعلق اپنے حال میں منفرد ہوتا ہے۔ ایک مکمل شخصیت کی یہ پہچان بھی ہے کہ اس کے تعلق سے رونما ہونے والے احوال دیگر تعلقات کے ساتھ خاص کیفیات کا بھی احاطہ کر لیتے ہیں۔ میں جب بھی ڈاکٹر صاحب سے ملا مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ انہیں دیکھ کر باطن میں ایک رَو سی چلنے لگتی ہے' جو میرے تمام مراکزِ تعلق میں زندگی اور حرارت کی شدّت بڑھا دیتی ہے۔ ان سے ملنا اپنی استعدادِ تعلق کو مکمل کرنے کا سامان رکھتا تھا۔ وہ ایسے آدمی تھے کہ ان کے طبعی داعیات بھی ایمانی تصورات سے مغائرت نہیں رکھتے تھے۔ اللہ کرے کہ ڈاکٹر صاحب کے متبعین اور متوسلین میں ان کی شخصیت کا یہ جوہر بھی ان کے افکار و خیالات کی طرح منتقل ہوا ہو۔ میری نگاہ میں ان کا یہ وصف ان کے تمام علمی و عملی محاسن پر فیصلہ کن فوقیت رکھتا ہے۔ وہ بلندیوں کا ایک سلسلہ تھے' جس میں یہ بلندی سب سے نمایاں ہے۔ کم از کم میرا تجربہ تو یہی ہے کہ میں نے جب بھی ڈاکٹر صاحب کو دیکھا تو یوں محسوس ہوا کہ اللہ کے حضور میں ہونے کے ایک وفور نے انہیں اپنے احاطے میں لے رکھا ہے۔ اور یہ حال کسی مشق یا ریاضت کا نتیجہ نہیں لگتا تھا' بلکہ اس کی بنیاد ایک ایسی چیز پر تھی جو تعلق باللہ کے مخصوص تصورات رکھ کر بعض متعیّن راستوں پر محنت و مشقت کے ساتھ چلنے والوں کی رسائی میں نہیں آ سکتی۔ یہ چیز تھی فطرت کی ایسی بیداری' جو شخصیت کے تمام عناصر میں نہ صرف یہ کہ سرایت کر جاتی ہے' بلکہ بندے کو موجود ہونے کی رفیع ترین حالتوں سے بالکل طبعی انداز میں مانوس کر دیتی ہے۔ ایسے لوگ خیال سے احساس تک پائے جانے والے تقریباً اٹل فاصلے کو ختم کر دینے کی قدرت بہم پہنچا لیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے لیے ان کے تمام تصورات ایک خوابناک سی کشش رکھتے تھے' بلکہ اتنے ہی یقینی تھے جتنے ہمارے لیے ہمارے محسوسات ہیں۔ ان سے واجبی علاقہ رکھنے والے حضرات بھی ان کے بارے میں کم از کم اتنا ضرور جان لیتے تھے کہ ان کے روزمرہ احساسات اور طبعی جذبات کا محرک عین وہی امر ہے جس نے ان کے ذہن کو منتہائے یقین تک پہنچے ہوئے تصوّرات ودیعت کیے تھے۔ وہ بلاشبہ ان خاص الخاص لوگوں میں سے تھے جو حق کے ساتھ مکمل ترین تنہائی کے متحمّل ہو سکتے تھے' یعنی انہیں اللہ کے ساتھ اپنا تعلق ایسا عزیز تھا کہ وہ ساری دنیا سے پوری جمعیتِ خاطر اور اطمینانِ ذہنی کے ساتھ منقطع ہو سکتے تھے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے خود کو

اپنے تصور سے بھی خالی کر رکھا تھا۔ اپنے تصور سے باہر ہو جانا ہی وہ مرتبۂ اخلاص ہے جس کے حصول کی تمنّا اللہ کے دوستوں کی متاعِ وجود ہوتی ہے۔

حق کا وہ وجودی استحضار جو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا قوام تھا' ان کی فکر بھی اسی سے وجود میں آئی ہے۔ ان کا ہر تصور ایک دائرے کی طرح ہے جو حق سے شروع ہو کر حق ہی پر تمام ہوتا ہے۔ وہ بھی اقبال' ابوالکلام آزاد' مولانا مودودی وغیرہ کی طرح قرآن کو زندہ کتاب کہتے تھے' مگر اس کتاب کا زندہ ہونا ان کے ہاں بعض ایسے مظاہر رکھتا ہے جو دیگر جلیل القدر لوگوں کی فکر میں نہیں آ پائے تھے۔ مثال کے طور پر اقبال قرآن کی قوتِ حیات کو انسانی خودی کے پیکر کی تکمیل میں صرف کر دیتے ہیں' ابوالکلام اس کی حیات آفرینی کو مُردہ ذہنوں کی مسیحائی کے لیے استعمال کرتے ہیں' مولانا مودودی کتابِ الٰہی کی حیات بخشی کو ایک آفاقی سکیل میں کارفرما دیکھتے اور دکھاتے ہیں —— ان تینوں جہتوں سے کوئی اصولی اختلاف کیے بغیر ڈاکٹر صاحب نے قرآن کی تاثیرِ حیات کو وجود کی روحانی سے لے کر حیاتیاتی اقلیموں تک جس پھیلاؤ اور گہرائی کے ساتھ کارفرما دکھایا ہے وہ ان کے قریبی زمانے میں یقیناً ایک نئی چیز تھی۔ اس کے نتیجے میں قرآن ایک ایسے وجودی انقلاب کا جوہرِ واحد بن گیا جو آدمی کو مراتبِ کمال تک پہنچاتا ہے' کائنات کی تعمیرِ نو کرتا ہے' عقل کو قبولِ ہدایت کا مادہ بخشتا ہے' اور اتنا ہی نہیں' اس سے بہت آگے بڑھ کر تقدیر اور تاریخ کو انسان کے توسط سے یک جان کر دکھاتا ہے۔

اس نادر اصول کو علمی اور عملی سطحوں پر نتیجہ خیز قوت کے ساتھ منطبق کر دکھانا ڈاکٹر صاحب کی فکر کا وہ امتیاز ہے جسے سمجھنا بہت ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ان کے قابلِ فخر پیش روؤں اور معاصرین نے قرآن کو کتابِ حیات کہا اور ڈاکٹر صاحب نے اس میں توسیع کر کے اس صحیفۂ انقلاب کو کتابِ وجود سے تعبیر کیا' اور جا بجا مختلف پہلوؤں سے اس نکتے کو اظہار کے متنوع مراحل سے گزارا کہ وجود کی اصل' اس میں کارفرما نظامِ حرکت اور اس کی صورتوں کو تشکیل دینے والا قانونِ قدرت' سب کا سب قرآن سے پھوٹتا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں فطرت اور ہدایت ایک ہو جاتی ہے اور اس وحدت کا تجربہ ہی حق کا حضور ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ قرآن اور سائنس کے موضوع پر مسلمان علماء نے جو تھوڑا بہت کام کیا ہے اس کا مقصود یہی معلوم ہوتا ہے کہ سائنس دانوں کو خوشامد درآمد کے ذریعے قرآن پر معترضانہ نظر ڈالنے سے روکا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی اس مضمون کو خاصی اہمیت دی ہے' لیکن کسی ایک جگہ پر بھی انہوں نے ایسی مداہنانہ روش اختیار نہیں کی' بلکہ اس میدان میں ان کی تمام کاوشوں کا خلاصہ یہ ہے کہ فطرت کی طرف یکسوئی کے نتیجے میں امرِ ہدایت میں مخفی حقائق تک اتفاقی رسائی ہو جاتی ہے' جسے بامعنی بنانے کا کام سائنس والے نہیں بلکہ وہ لوگ کریں گے جو قرآن کے علوم میں رسوخ رکھتے ہیں۔ قرآن کا عطا کردہ ذوقِ حقائق اتنا قوی ہے کہ صورتوں کا causal structure اس سے مستغنی ہو کر قائم نہیں رہ سکتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ علمِ ہدایت اور علمِ فطرت کی وحدتِ اصلی کی طرف اشارہ کرنے والا کوئی ایسا تناظر قائم کیا جا سکتا ہے جو اس سے بہتر ہو۔

یوں تو ڈاکٹر صاحب کی ہر تحریر ان کے نظامِ فکر کی تشکیل میں ایک انفرادی اور ناگزیر حیثیت رکھتی ہے' تاہم ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ'' نامی رسالہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی فکر میں بیج کی حیثیت رکھتا ہے۔ انیسویں صدی میں

مغرب کے ہمہ گیر غلبے کی وجہ سے مسلم ذہن میں چند رجحانات پیدا ہوئے۔ ان رجحانات کی ساخت ایک پہلو سے علمی تھی تو دوسری جہت سے عملی۔ اس غلبے نے ہماری نفسیات' ذہنیت اور ہماری تہذیب پر بالکل اسی طرح کے اثرات مترتب کیے جیسی تاثیر کسی ہمہ گیر نظریے یا ہماری اصطلاح میں دین میں ہوتی ہے۔ یعنی مغرب کا غلبہ انسان کو اس کی تمام سطحوں پر موجود ہونے کے ایک نئے اسلوب کی طرف دھکیل رہا تھا۔ اس کے سامنے ہستی کے گزشتہ تمام اصول' خواہ دینی ہوں یا دنیاوی' انہیں چھوڑنا لازم اور ناگزیر تھا۔ اس غلبے کے آگے مسلمانوں کی دفاعی جدّوجہد کے نتیجے میں ایک ایسا ذہن اور مزاج سامنے آیا جسے انقلابی کہنا شاید درست ہوگا۔ انیسویں صدی سے شروع ہو کر بیسویں صدی تک اپنے کمال تک پہنچنے والا یہ ذہنی' تہذیبی اور نفسیاتی رویہ دراصل اپنی بقا کے تمام امکانات کو مغرب سے پیدا ہونے والے اس جبری تعلق کی روشنی میں دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ بالفاظِ دیگر ہمارے دینی ذہن کی روایت میں ایک ایسے انقلابی مادے نے نمو پکڑنی شروع کر دی تھی جس کا خالق غالباً دین نہیں تھا بلکہ غلبۂ مغرب تھا۔ اس وجہ سے اس انقلابی فکر نے ہمارے دین کو کچھ نئی تعبیرات سے گزارنے اور کچھ نئی تعریفات کو قبول کروانے کا بیڑا اٹھایا' اس فکر میں شروع ہی سے ایک عدمِ توازن تھا' اور وہ یہ کہ اس میں اسلام کے اندر خود بخود پہلے سے پائی جانے والی انقلابی قوت کو غلط طور پر دیکھا گیا اور اسلام میں پیدا ہونے والی روحِ انقلاب کو محض ایک خارجی جسد میں محبوس کرنے کا قصد کیا گیا' جس کی وجہ سے دین کی بنیادی تعبیر یا دین کو قبول کرنے کے فطری زوایے میں خلل سا پڑتا محسوس ہوا' اور وہ یہ کہ ایک پہلو سے یہ دین محض ایک آرڈر بن کر رہ گیا اور دوسرے رخ سے یہ ایک ایسے آئیڈیلزم کے رنگ میں ڈھل گیا جو تمناؤں کو تسکین تو پہنچا سکتا تھا لیکن ان کی تکمیل کا سامان فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ ایک مدت تک غلبۂ مغرب کے مقابل ہو کر پنپنے والی انقلابی تعبیرات اور تحریکی تصوّرات ان دونوں خانوں میں بٹے رہے۔ ایک یہ سمجھتا رہا کہ مغرب گویا ایک طاغوتی نظام ہے جس کو ہم اعلائے کلمۃ الحق کی جدّوجہد یا اعلائے کلمۃ الحق کو مرکز بنانے والے دوسرے نظام سے بدل سکتے ہیں یا دوسرے نظام سے شکست دے سکتے ہیں۔ دوسری طرف یہ اندازِ نظر تھا کہ مغرب کے غلبے کے آثار محض ایک نظام کے قیام کا تقاضا نہیں کرتے' بلکہ اس کے علاوہ اس چیز کے بھی متقاضی ہیں کہ ہم مغرب کے idealistic structure کو تھامنے کے لیے خود اپنے دین کو انہی بنیادوں پر کامیابی سے بروئے کار دکھائیں جن بنیادوں کو مغرب اپنے استعمال اور تصرف میں لایا تھا' بلکہ اس سے بڑھ کر جن بنیادوں کو مغرب نے خود پیدا کیا تھا۔ مغرب کے آئیڈیلز کو تھامنے والے ستونوں کی تعمیر اس دین میں بھی شروع ہوگئی۔ اس طرح کے انقلابی اور تحریکی ماحول میں یا ردِّ مغرب کی مسلم روایت کا زیادہ تر حصہ انہی دو رویوں میں منقسم نظر آتا ہے۔

میری رائے میں اس روایت سے دو استثناء ہیں' ایک مولانا مودودیؒ دوسرے ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ۔ مودودی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے انقلاب میں درکار ideals کو محض جذبات کی تحویل میں نہیں چھوڑا بلکہ اسے عمل میں ڈھالنے کا بھی رستہ نکالا۔ مولانا مودودی کی فکر کے بعض یا اکثر اجزاء پر اعتراض یا اشکال محسوس کرنے کے باوجود لگتا یہی ہے کہ اصولی طور پر ان کا موقفِ انقلاب درست تھا اور اس موقف پر دینی اطمینان اور اعتماد کے ساتھ کھڑے رہنے کی بہت زیادہ گنجائش تھی۔ ان کی فکر اپنی اصولی ساخت میں دین کو بدل دینے والی

تعبیر تک نہیں پہنچتی تھی۔ چونکہ ہم اس وقت ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک کتاب پر گفتگو کر رہے ہیں اس لیے مودودی صاحب کے اس خاص الخاص وصف کی تفصیل میں جانے سے بچ کر یہاں اس دروازے سے ڈاکٹر صاحب کی فکر کے ایک امتیازی جوہر تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ اس پہلو سے ڈاکٹر صاحب اصلاً مولانا مودودی کی روایت ہی کے آدمی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مودودی صاحب کے اس اصول پر بہت بامعنی اضافہ کیا۔ وہ یہ ہے کہ ان کی عملیت پسندی مودودی صاحب کی طرح اجتماعی (communal) ہونے کے باوجود انسان کے خلقی ارادے کا موضوع بننے کی زیادہ قابلیت رکھتی ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ مودودی صاحب کے یہاں عمل کا ڈھانچہ اخلاقی و نظریاتی زیادہ ہے جس میں آدمی کی خلقی استعداد کو اہمیت نہیں دی گئی' جبکہ ڈاکٹر صاحب عمل کو اس کے اخلاقی جوہر پر استوار رکھتے ہوئے اپنے مخاطب کی صلاحیت عمل کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز نہیں کرتے بلکہ اسے ایک بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ میرے خیال میں ان کی فکر ایک جدلیاتی ساخت اور قطبینی تعامل رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خلقت کو اخلاق سے' عمل کو تصور سے' تاریخ کو تقدیر سے اور انفس کو آفاق سے ان کے بنیادی امتیازات سمیت بہت متحرک' بہت نتیجہ خیز انداز سے ہم آہنگ کر دکھایا ہے۔ یہ چیز کچھ اشاروں کی طرح بھی کہیں اور نہیں ملتی۔

ہم سب یہ جانتے ہیں کہ انقلاب کا قوام بننے والی فکر ہمیشہ جدلی ہوتی ہے اور اس میں آدرش اور عمل کے درمیان پائے جانے والے ناگزیر فاصلے کو جذبات کے وفور سے کم یا ختم نہیں کیا جاتا' بلکہ اس فاصلے کو ایک ایسا خلا بننے سے بچالینا ہی کافی ہوتا ہے جہاں نہ مقصد کی قبولیت کا کوئی امکان ہو اور نہ اس مقصد کی اساس پر پیدا ہونے والے عمل کی پیدائش کا کوئی رستہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے ideal اور actual کے امتیاز کو اپنی شدید ترین تمنائے انقلاب کے باوجود نہ صرف یہ کہ ملحوظ رکھا بلکہ ان کے درمیان کچھ ایسی نسبتیں دریافت کر کے دکھائیں جن کی کارفرمائی سے ان دونوں کا باہمی امتیاز تضاد یا تصادم کی صورت اختیار کرنے سے محفوظ رہے۔ ان کے ہاں یہ نادر بصیرت قدم قدم پر نظر آتی ہے کہ آئیڈیل میں ایک بہت بنیادی عنصر اس کے مآلِ عملی ہونے کا ہوتا ہے۔ انسان وجود اور شعور کی تمام تر قوت اور آمادگی کے باوجود ideal کی سو فیصد actualization پر اصرار نہیں کرتا۔ اصرار تو دور کی بات ہے وہ اس تصور کو بھی اجنبی گردانتا ہے جو آئیڈیلز کو exhaustably actualize کرنے کی امید دلاتے ہیں۔ انسان اور دنیا کی اس مستقل وجودی تحدید کے گہرے ادراک کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ انقلاب کے تصور اور انقلاب کی جدّوجہد میں کثیر المراتب نسبتوں کو کس طرح محفوظ رکھا جائے کہ تصور میں کوئی کمی نہ کرنی پڑے اور عمل کو کسی نقطۂ اختتام سے دور رکھا جاسکے۔ یعنی آئیڈیل کا جوہر کمال ہے اور عمل کا انحصار صداقت پر ہے۔ ایک کو ہر حال میں کامل رہنا چاہیے اور دوسرے کو اپنی خلقی تحدیدات کی وجہ سے کمال تک پہنچنے کا ادّعا رکھنے کی بجائے صداقت کے جوہر سے ابھرنے والی یکسوئی کو برقرار رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے آئیڈیلز کو ایک ہمہ گیر تصور کے طور پر تشکیل دینے میں کسی idealist سے پیچھے نہیں ہیں' اور اس کے ساتھ ساتھ انسان کے عملی وجود اور اس کی استعداد کی پوری رعایت

رکھتے ہوئے اسے کام میں لانے کی صورتیں نکالنے میں بھی ان جیسا مفکر مشکل سے ملے گا۔ یہ بات بعض اوقات حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ وہ مثال کے طور پر' تاریخ اور تقدیر کو کتنی پختگی اور سہولت کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ گندھا ہوا دیکھتے اور دکھاتے ہیں..... تاریخ جو عمل کا موضوع ہے اور تقدیر جو عقل کی پراپرٹی ہے! ان دونوں' عمل کا زمانی اور خیال کا لازمانی ہونا' ڈاکٹر صاحب کی فکر میں خمیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس رسالے میں غالباً نشاۃ ثانیہ کے تصور کو مسلمانوں میں موجود تمام تعبیرات سے زیادہ محکم اور مکمل حالت میں بیان کیا گیا ہے۔ دینی ذہن کے لیے انقلاب' تجدید یعنی نشاۃ ثانیہ کا نام ہے' یعنی انسان اور اس کی دنیا میں پیدا ہو جانے والی تمام خرابیوں کو اس خاص وقت کے محاسن اور کمالات کو حاصل کر کے ہی بدلا جا سکتا ہے جس وقت میں دین کے بانی نے حق کو زندگی کی ہر باطنی اور ظاہری سطح پر خلق کے اوپر حتماً غالب کر کے دکھایا تھا۔ انسان' دنیا اور زمانے میں حق' خیر اور حسن کی جتنی بھی استعداد پائی جاتی ہے اسے بانیٔ دین یا امامِ ہدایت استعمال میں لا کر دکھا دیتا ہے۔ آگے چل کر جب انفس و آفاق میں سرایت کر جانے والے کمالات ضعیف پڑنے لگتے ہیں تو اس دین پر چلنے والے اپنی روحانی' ذہنی' اخلاقی' ارادی اور طبعی قوتوں کو مجتمع کر کے ان کمالات کے احیا کی طرف یکسو ہو جاتے ہیں۔ دینی انقلاب اپنی تمام تر تفصیلات کے ہر ہر جز میں اسی اصول پر کھڑا ہوا ہے۔ ہماری انقلابی فکر کی روایت میں اس اصول پر کسی کا اختلاف نہیں' فرق وہاں سے پڑتا ہے جہاں کچھ لوگ انفس کو آفاق پر ترجیح و تقدیم دیتے ہیں اور بعض افراد اس کے برعکس۔ انفس کے تقدم کی بنیاد پر آفاق کی تشکیلِ نو کا تصور اس روایت کے غالب حصے میں موجود نہیں پایا جاتا' حتیٰ کے مولانا مودودی کے ہاں بھی نہیں۔ غالباً پہلی مرتبہ ڈاکٹر صاحب نے اس نکتے کو بہت واضح طریقے سے اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا رسالہ ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ'' ایک بہت قیمتی دستاویز ہے۔ اپنی اس تحریر میں انہوں نے بہت محکم اور مفصل انداز سے یہ بتایا ہے کہ نشاۃِ ثانیہ کا کوئی تصور اس ''مثالی باطن'' کی بازیافت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا جو رسول اللہ ﷺ نے انفس کے پورے پھیلاؤ کے ساتھ قائم کر کے دکھایا تھا۔ یہ پھیلاؤ ایسا ہے کہ آفاق اس کو محیط نہیں ہے بلکہ اس میں گوشہ گیر ہے۔

فکری افتاد کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کے تمام تصورات ایک نظریہ انقلاب کے اجزاء کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا مادۂ فکر انقلاب ہے اور انہوں نے اس کے ذہنی مظاہر ہی پیدا نہیں کیے بلکہ اسے طبیعت اور ارادے کا مستقل ہدف بنا کر گویا زندگی اور انقلاب کو ہم معنی اور ہم احوال کر کے دکھا دیا۔ ڈاکٹر صاحب اس کلاسیکی روایت کے شاید آخری نمائندے ہیں جن کے ہاں اصول کی اجمالی ساخت کو اس ہمہ گیری کے ساتھ کھولا گیا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اصول کو اس کے اجمال کی پوری نگہ داری کے ساتھ اس طرح بیان کر دیا ہے کہ جو اسے مجمل رکھتے ہوئے ذہنی اور ارادی یکسوئی کا واحد ہدف بنانے کے لائق کر دیتا ہے۔ یہ اس رسالے کا structure ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ ڈاکٹر صاحب کا آئیڈیلزم ذہن کی تصور سازی کی عمدہ قوتوں سے تشکیل پانے کے باوجود عمل پذیری کے امکان بلکہ استعداد کو کسی پہلو سے اوجھل نہیں رہنے دیتا۔ اس رسالے کے ہر قاری کو بلا تکلف یہ محسوس ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کا مقصودِ فکر اپنے اجمال اور تفصیل دونوں میں عمل سے ایسی مناسبت رکھتا

ہے جو معمول کے اسلوبِ عمل سے مختلف تو ہے مگر اس کے لیے اجنبی نہیں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انقلابی فکر کی روایت کا سب سے قیمتی جوہر یہی ہوتا ہے کہ تصور اپنے تمام تر اطلاق اور کلیت کے باوجود عمل کا محرّک اور منتہا بننے کی صلاحیت حاصل کر لے۔ اس رسالے میں ڈاکٹر صاحب کا مرکزی تصور مصداق بننے کے اکثر تقاضے پورے کر دکھاتا ہے اور قدرے گہرائی میں جا کر تجزیہ کیا جائے تو یہ انکشاف بھی میسّر آ سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک اعلیٰ درجے کی ٹھیٹھ فلسفیانہ سطح پر بھی تکنیکی ضوابط کی پابندی کیے بغیر انسانی شعور کے ایک بنیادی اقتضاء کو پورا کیا ہے۔ وہ اقتضاء ذہن' ارادے اور طبیعت کی یک اصلی اور یک ہدفی کا حصول ہے۔ مجھے اپنے طور پر تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ ''اسلام کی نشأۃِ ثانیہ'' میں قوائے شعور اور قوائے ہستی میں کارفرما اس فعال وحدت کو دریافت کیا گیا ہے جس کے بغیر انسان اور دین میں کوئی نتیجہ خیز نسبت فراہم نہیں ہو سکتی۔ اور یہی نہیں' خود انسان کی اندرونی تشکیل اور تاریخی تکمیل بھی اس وحدت تک پہنچے بغیر ممکن نہیں رہتی' کیونکہ ڈاکٹر صاحب انسان کے باطن کو حضورِ حق اور اس کے ظاہر کو امرِ حق کے جوہر پر استوار مانتے ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں نفسِ انسان اور عالمِ انسان یا انسان کے اندرونی نظام اور اس کی خارجی دنیا کی اصل واحد ہے' اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے غیر مربوط رکھنے کا نتیجہ ان کی نظر میں اس کے سوا کچھ نہ نکلے گا کہ آدمی کا باطن بھی مسخ ہو کر رہ جائے اور اس کی دنیا بھی انارکی کی لپیٹ میں آ جائے۔ ہمارا ایمانی وجود ہمارے تاریخی وجود سے منقطع اور لاتعلق ہو کر نہ اپنی تشکیل کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنی بقا کے اسباب فراہم کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ندرتِ فکر یہ ہے کہ برصغیر کی حد تک انہوں نے پہلی مرتبہ انسانیت کے باطنی اصول یعنی ایمان کو اس کے تاریخی اصول پر حتماً غالب کر کے دکھایا' اور اس غلبے کو جن دلائل پر استوار کیا وہ دلائل ٹھیٹھ مذہبی یا کلامی نہیں بلکہ تاریخی ہیں۔ یہ ایک بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے کہ ایک چیز کو دوسری پر اصولاً غالب رکھتے ہوئے اس پر منحصر بھی کیا جائے۔ میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب کی تمام فکر کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اس توازن کے دہرے پن کو گرفت میں لے آتی ہے جسے ملحوظ نہ رکھنے سے انقلاب کے بعض مراحل تسلیم سے اور ارادے کے اکثر مراتبِ تعمیل سے خارج رہ جاتے ہیں۔ اس بات کو شاید ابھی تجزیے کی ضرورت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے خواب اور تعبیر کے تقدیری توازن کو کس کس زاویے سے برقرار رکھا' اور صرف برقرار ہی نہیں رکھا' بلکہ ان کے درمیان ایک دوسرے کو متاثر کرنے والے اصول تک بھی رسائی حاصل کی۔ ایک خاص ذوق کے دائرے میں رہتے ہوئے بات کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے تعلق مع الحق کو انسان کی پوری وجودی استعداد کے ساتھ بیان کرنے کی ایک حیرت انگیز حد تک کامیاب کاوش کی ہے۔ اس کاوش کے mechanics اگر سمجھ لیے جائیں تو دین' آدمی اور دنیا اپنی مشترک اصل اور اپنی فطری نسبتوں پر پھر سے قائم کیے جا سکتے ہیں۔ یہی نشأۃِ ثانیہ کا وہ تصور ہے جس کا ادراک و اظہار ڈاکٹر صاحب کے حصے میں آیا۔

اوپر جو ہم نے اصول کے اجمال و تفصیل کی بات کی تھی اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اجمال اصول کی طرف یکسو رہنے کی راہ فراہم کرتا ہے اور تفصیل کسی چیز کو اصول کے دائرے سے باہر نہیں ہونے دیتی۔ اس استحضار' یکسوئی اور احاطے کو ڈاکٹر صاحب نے ایسے زاویوں سے ہم آہنگ اور محفوظ کر رکھا ہے کہ انسان اور

کائنات کے بارے میں ایسی بصیرت میسّر آ جاتی ہے جو ان دونوں کی تحقیق کا ذمہ لینے والے مستند اور معیاری علوم کے لیے بھی قابلِ قبول ہیں۔ متداول مذہبی ذہن عموماً انسان اور کائنات کا ایک اجنبی یا متروک یا بے تاثیر تصور رکھتا ہے جس کی تعمیر میں ذہن کی جن قوتوں نے حصہ لیا تھا وہ خاصی پسماندہ ہیں' اور خود ذہن کب کا ان سے دستبردار ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے موجودہ مذہبی ذہن کو اس کمزوری سے نکالا ہے اور انہوں نے دین کو بنیادی مادہ بنا کر انسان اور دنیا کی وہ تعبیرات تشکیل دی ہیں جو کسی بھی مستند علم کی روایت میں کم از کم ایک وقعت ضرور رکھتی ہیں۔

انقلابی فکر میں جس اصول اور نصب العین کو عمل میں لانے کی ضرورت ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب اس اساس اور ہدف کو انسان کی استعدادِ عمل اور تاریخ کے مزاجِ تغیّر کی جیسی گہری رعایت رکھتے ہوئے جامۂ عمل پہنانے کا راستہ کھولتے ہیں وہ انقلابی فکر کی روایت میں خاصے کی چیز ہے۔ مثال کے طور پر ان کے مشہور رسالے ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ'' میں اصول کو عمل میں لانے کی کم سے کم تغیر پذیر تدبیریں بتائی گئی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ عملِ نظام کو تغیر سے دور رکھنا ایک مشکل کام ہے' جو ڈاکٹر صاحب کی تمام تحریکی اور انقلابی تحریروں میں بہت خوبی سے کیا گیا ہے۔ نظریے کے مراحلِ تعمیل کو شعور کے معمولی تغیرات اور وقت کی روزمرہ تبدیلیوں کی زد سے بیش از بیش باہر رکھنا کسی بھی ورلڈ ویو کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں کے متجدّدین کم از کم اس بات کو بالکل نہیں سمجھتے کہ ذہن اور خارج میں سر اٹھانے والی ہر تبدیلی اتنی اہم اور بامعنی نہیں ہوتی کہ اسے اصول کی actualization میں دخیل کر لیا جائے۔ انسان اور اس کی دنیا میں حرکت کا فطری اصول زیادہ تر خواہش پر مبنی اور تقریباً جبلی ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تغیرات کو قابو میں رکھنا ضروری ہے نہ کہ اسے مصنوعی اہمیت دے کر اصول میں ملاوٹ کا ذریعہ بنا لینا۔ ڈاکٹر صاحب تاریخ اور انسان کے بارے میں ایک نادر بصیرت رکھتے ہیں اور اس لیے بخوبی جانتے ہیں کہ انسان کے نفسی محرکات اور تاریخ کی سطحی واقعیت اس لائق نہیں ہوتی کہ وہ مستقل نظریے کو عملی مظاہر فراہم کر سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ حرکت کے جبری' حیاتیاتی بلکہ جبلی نظام کے لیے پوری نظریاتی قوت کے ساتھ انکار کا رویہ اختیار کیا جائے تاکہ تبدیلی کا ناگزیر اور ہمہ گیر عمل بالکل ہی بے اثر ہو کر نہ رہ جائے۔ ڈاکٹر صاحب اسی لیے تبدیلی کو پیدا کرنے کی دعوت دیتے ہیں' اسے واقع ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ ٹھیٹھ علمی اصطلاح میں کہا جائے تو ان کا مدارِ فکر یہ ہے کہ دین پر قائم اور حق سے نمو پانے والا شعور زندگی کے تمام تر نظامِ حرکت و سکون پر غالب آ کر دکھائے۔ ان کی نظر میں انقلاب کا اصل ہدف یہی ہے اور اسی مادے سے زندگی کے بہاؤ کو ایک انسانی حرکت اور انسانی سمت میسر آتی ہے۔ ان کے ہاں نفس پر غلبے کو تاریخ کا فاتح بننے کے لیے ضروری اسی لیے قرار دیا گیا ہے کہ زندگی کی معنی آفرینی کا عمل لازم ہے کہ انسان کے اندر تشکیل پائے اور پھر زندگی کی کائناتِ صورت میں ایک اصول کی طرح سرایت کر جائے۔

بدقسمتی سے ہمارے مذہبی ذہن میں بھی انقلاب کا تصور قوت و طاقت کے ساتھ اس قدر وابستہ ہو چکا ہے کہ انسان کی باطنی تکمیل کا تخیل سرے سے نظر انداز ہو گیا ہے۔ انسان کا خود پر غلبہ ڈاکٹر صاحب کے تصورِ

انقلاب کی بنیاد بھی ہے اور منتہا بھی۔ یہ غلبہ تزکیے کے روایتی' روحانی و اخلاقی معنی میں نہیں ہے' بلکہ یہ ایک طرح سے انسان کی پوری تعمیرِ نو کا عمل ہے جس کے ذریعے سے آدمی حیاتیاتی سطح سے وجودی مرتبے تک پہنچنے کا سفر طے کرتا ہے۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں کسی بھی طرح کی داخلیت پسندی نہیں پیدا ہوتی' بلکہ انسان خود سے وہ ضروری فاصلہ پیدا کرنے پر قادر ہو جاتا ہے کہ جس کے بغیر ذات کی تعمیرِ نو نہیں ہو سکتی۔

ایک داعیٔ اسلام کو آج کی دنیا میں کسی بڑے کام کا منصوبہ بناتے وقت مغرب کو جتنی اہمیت دینی چاہیے وہ ہمارے تحریکی اور انقلابی لٹریچر میں نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ یہ بات دورِ جدید کے بدیہیات میں سے ہے کہ آج انسان و کائنات اپنے ہر ہر جزو میں مغرب کی دی ہوئی تعریف پر قائم نہیں بلکہ موجود ہیں۔ تاریخِ انسانی میں یہ پہلی بار ہوا ہے کہ کوئی ایک نظریہ اور طرزِ حیات انفس و آفاق کو اس طرح محیط ہو جائے کہ اس کے باہر ذہن کے لیے بھی بس خلا ہی خلا ہو اور زندگی کے باہر بھی بس عدم ہی عدم ہو۔ مغرب کے اس ہمہ جہتی تسلّط سے آنکھ بند کر لینا ایک سادہ لوحی تو ہے ہی' دینی طور پر بھی مضر ہے۔ ہماری متداول مذہبی فکر نے مغرب کا جو تصوّر باندھ رکھا ہے اور اس بنیاد پر اس کے لیے جو رویہ اختیار کیا ہوا ہے وہ سرے سے مضحکہ خیز ہے۔ ہمارے موجودہ زوال کا غالباً سب سے زیادہ ثابت شدہ سبب یہی ہے کہ ہم نے مغرب کو ایک دینی اور روحانی بصیرت کے ساتھ سمجھنے اور پھر عمل و تدبیر کی برترین سطح پر پہنچ کر اس کی مقاومت کرنے میں مسلسل نااہلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہمارے مذہبی طبقات اس پر جس طفلانہ خود اعتمادی کے ساتھ یلغار کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ اس سے مغرب کا تو کچھ نہیں بگڑ سکتا ہمارا ہی دینی نقصان ہو رہا ہے۔ یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ مغرب انسانی کمالات اور دُنیوی ترقی کا واحد ماڈل بن چکا ہے۔ اس نے انسانیت کے جو اصول اور تاریخ کے جو قوانین مقرّر کر دیے ہیں وہ گویا آئینِ فطرت کی طرف ساری دنیا پر نافذ ہو چکے ہیں۔ اس غلبے کو جذباتی نعروں' غضب ناک بڑھکوں اور احمقانہ خوش فہمیوں سے نہیں توڑا جا سکتا۔ سرِ دست ہم ایک دیو پر بونوں کی طرح یلغار کر رہے ہیں اور اس کا جو نتیجہ نکلنا تھا اسے مسلسل بھگتتے چلے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے غالباً پہلی مرتبہ مغرب کی قوت کے واقعی اسباب کا ادراک کیا اور پھر اس کی طاغوتی روح سے نبرد آزما ہونے کے لیے کچھ ایسے وسائل ڈھونڈنے کی کوشش کی جو ذہنی' اخلاقی اور عملی سطح پر آج کل کی طرح کی پسماندگی کے مظاہر نہ ہوں۔ مغرب نے تسخیرِ کائنات کے مقصود کو جس یکسوئی اور کامیابی کے ساتھ ممکن الحصول باور کروایا ہے ڈاکٹر صاحب اس سے کوئی ٹکراؤ نہیں پیدا کرنا چاہتے بلکہ اس تسخیری قوت کو اپنے کام میں لانا چاہتے ہیں۔ ان کا اصل نکتہ یہ ہے کہ تسخیرِ عالم کی طرف ایک غیر متوازن یکسوئی نے مغرب کو جس دنیا پرستی میں دھکیل دیا ہے اس سے صرف تسخیرِ آدم کے ذریعے سے نکلا جا سکتا ہے۔ وہی تسخیرِ آدم جو اس دنیا میں اسلام کا اصل مقصود ہے۔ آدم سازی کی اقدار اگر عالمگیری کے عمل پر رہنمایانہ انداز میں غالب آ جائیں تو یہاں انقلاب کا پورا آئیڈیل گویا بہ تمام ہی عمل میں آ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کائنات کے mechanics اور دنیا میں افادہ رسانی کی استعداد کو استعمال کرنے کے معاملے میں مغرب سے پنجہ کشی کو بے سود سمجھتے ہیں اور اپنی ساری توجہ اس عمل پر

مرتکز رکھتے ہیں کہ انسانی شعور میں وہ انقلاب کیسے برپا کیا جائے جو مغرب کی کائناتِ صورت کو ایمانی معنی فراہم کردے۔ مغرب نے جس طرح انفس کو خلا بنا کر آفاق کو معمور کر رکھا ہے ڈاکٹر صاحب کی مبارزت اسی المیے سے ہے۔ وہ کائنات کی مغرب کی طرف سے کی گئی معموری کو تقریباً قبول کرتے ہوئے اسے انفس کی تعمیر میں ایک جزو بنانا چاہتے ہیں۔ یہ وہ رویہ ہے کہ جس کی ہمیں بہت زیادہ ضرورت تھی مگر ہماری مذہبی فکر کے تابع جذبات ہو جانے کی وجہ سے کبھی پوری نہ ہو سکی۔ آخر اس چیز کے کوئی معنی تو ہوں گے کہ ڈاکٹر صاحب نظریۂ ارتقاء اور بگ بینگ تھیوری وغیرہ پر بہت زیادہ ناقدانہ نظر نہیں رکھتے' لیکن مغرب کے سماجی اور نفسیاتی اصول کو الف سے یے تک رد کرنے پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ وہ کائنات کے طبیعی اور مادی تجزیے میں مغرب کی تحقیقات کو ہمارے ایمانی تناظر سے متصادم نہیں دیکھتے' لیکن مغرب کے تصورِ انسان کو اپنے دین کے لیے سب سے بڑا خطرہ جانتے ہیں۔ یہی وہ درست پوزیشن ہے جہاں سے ہم کامیابی کی غالب امید کے ساتھ مغرب پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ خالص universtality اور منتشر particularity دونوں ہی گویا ناکام ہونے کے لیے جنم لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں کو synthesize کیا ہے اور ان کے امتیازات کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی وحدت کو ایک ورلڈ ویو کی تشکیل میں صرف کیا ہے۔ یہ ورلڈ ویو تقدیری بھی ہے اور تاریخی بھی' سیاسی بھی ہے اور روحانی بھی' اور مستقل بھی ہے اور متغیر بھی۔

اس کتاب میں ایک خاص تصورِ انقلاب بھی ملتا ہے جسے کھولنے کی ضرورت ہے۔ ایک مسلمان کے لیے اس کے دین کی نشاۃِ ثانیہ اس کے تمام تصورات کا بنیادی مادہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے انقلاب کو تبدیلیٔ حالات سے کہیں بڑھ کر تبدیلیٔ احوال کے حصول کے لیے متصور کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے حالات اور احوال کی complimentary وحدت بلکہ organic identity کو جس طرح کم سے کم تصوراتی نہج سے واضح کیا ہے وہ مسلمانوں کے انقلابی لٹریچر اور تحریکی روایات میں ایک نئی چیز ہے۔ اس کا بالکل clinincal تجزیہ درکار ہے' مگر اس کی سطح ایسی ہونی چاہیے کہ بلند تر اذہان بھی اسے قبول کریں' گہری طبیعتیں بھی اسے منتہائے رغبت بنائیں اور مضبوط ارادے کے لیے بھی اس سے کوئی سمت حرکت نکالی جا سکے۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک بڑا امتیاز ہی یہ ہے کہ اسلام اور مقاصدِ اسلام پر غور و فکر کرتے وقت وہ جن نتائج تک پہنچتے ہیں انہیں انسانی قابلیت کے تمام مراکز کے لیے موجب قبول اور باعثِ تسکین بنا دیتے ہیں۔ یہ مجموعی پن جو انسانی استعداد و حقائق میں اتحاد پیدا کرتا ہے' بہت غور کے ساتھ لائق تجزیہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے انقلابی تصورات اور تجدیدی افکار اپنی ساخت میں یوٹوپین ہونے کے باوجود ہر پہلو سے قابل عمل لگتے ہیں' یہ ایک نادر چیز ہے اور اسے اچھی طرح کھولنا چاہیے۔ یہ بھی دیکھنا ہے کہ نشاۃِ ثانیہ اپنے معروف تصورات کے مطابق محض تجدیدیت نہیں ہے بلکہ تجدیدِ ایمان کا وہ عمل ہے جو انقلاب کے لیے درکار باطنی reconditioning کا سب سے پہلے تقاضا کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی فکر پر باتیں تو بہت سی کی جا سکتی ہیں' لیکن اپنی کم بضاعتی کی وجہ سے میں آخر میں یہی کہوں گا کہ آئیڈیلز کو بروئے کار لانا انسان کے شعور و وجود کا وہ منتہا ہے جہاں ان دونوں میں فرق نہیں رہتا۔ ایمان و

عمل کے تلازم کے مبحث میں یہی اصول کارفرما ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے آئیڈیلز کو پوری طرح بیان کیا ہے اور پھر اسے عمل میں لانے کے لیے ایسی تدابیر بھی نکالی ہیں جو ہمارے معمول کے نظام العمل اور استعدادِ فعل کے لیے نامانوس نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا یہ اصرار صحیح ہونے کے ساتھ ساتھ اتنا فطری ہے کہ قرآن ہی وہ کتاب ہے جو آئیڈیلز بھی فراہم کرتی ہے اور ان کی actualization کے لیے درکار قوت بھی یہیں سے ملتی ہے۔ بعض لوگ اس بات پر معترض ہیں کہ ڈاکٹر صاحب سیرت النبی ﷺ سے بڑے بڑے اصولِ اعتقاد و عمل اخذ کرتے ہیں۔ یہ اعتراض تعجب خیز ہے' کیونکہ سیرت کی اس مرکزیت کا انکشاف تو ڈاکٹر صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ وہ نہ ہوتے تو شاید ہمیں پتا نہ چلتا کہ رسول اللہ ﷺ تمام آئیڈیلز کے actualizer بن کر تشریف لائے تھے اور آپ ﷺ کے سوانح دراصل تاریخ پر انسان کی فتح کی روداد ہیں۔ اسی سے تو وجود کی انسانی ساخت کو تاریخ کی جدلیاتی ساخت پر غالب آنے کا راستہ ملتا ہے۔ نشاۃِ ثانیہ کا ہر تصور سیرت کی تجدید پر منتج ہوتا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو ہم قرآنی آئیڈیلز کے authentic mode of actualiztion سے محروم رہ جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے جس رویے پر تنقید کی جا رہی ہے وہ درحقیقت اسلام کی انقلابی فکر کو اس کی بنیاد فراہم کرنے کا عمل ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ڈاکٹر صاحب کی فکر پر نقد و جرح کی کوئی گنجائش نہیں' یقیناً ہے' لیکن ان کے ناقدین کی اکثریت حق کی اس انفسی حاکمیت اور آفاقی شکوہ کا کوئی تصور نہیں رکھتی جو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا جوہر ہے اور ان کی فکر کا بنیادی مادہ۔ ڈاکٹر صاحب نے ممکن ہے کہ کچھ راستوں کے انتخاب میں یا کچھ تفصیلات کے تعین میں غلطی کی ہو لیکن ان کا مقصود بہرحال قرآن ہی ہے' دین ہی ہے۔ جب کہ ان کے بیشتر مہربانوں نے چاہے راستے بہت اچھی طرح تراش لیے ہوں مگر ان کی مطلوبہ منزل نہ پوری طرح قرآنی ہے نہ exhaustively دینی۔

❁❁❁

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 40 روپے اشاعت عام: 25 روپے

فقہ اسلامی کا ارتقاء

محمد انس احسان ☆

فقہ اسلامی کے تاریخ کے اعتبار سے چھ ادوار ہیں[1]۔

(۱) عہدِ رسالت (۲) خلافتِ راشدہ (۳) دورِ بنی امیہ (۴) دورِ بنی عباس
(۵) جمود و تقلید کا دور (۶) دورِ حاضر۔

عہدِ رسالت (پہلا دور)

نبی کریم ﷺ کے عہد میں فقہ سے متعلق جملہ امور آپ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ سے وابستہ تھے۔ چنانچہ قانون سازی اور دیگر احکامات آپ ﷺ بنفسِ نفیس خود انجام دیا کرتے تھے۔ اس دور میں فقہ کی نہ تو باقاعدہ تدوین ہوئی تھی اور نہ ہی اس کی بہت زیادہ ضرورت محسوس کی گئی تھی۔ اس دور میں فقہ کے ابتدائی دو ماخذ یعنی قرآنِ کریم اور سنّتِ نبویہ سے استشہاد کیا گیا اور صورت یہ رہی کہ جیسی جیسی ضرورت محسوس ہوتی گئی اسی لحاظ سے احکامات متعیّن ہوتے گئے۔ احکامِ الٰہی کی ان تشریحات کی ذمہ داری بھی قرآن کریم نے آپ ﷺ ہی کی ذمہ داری بتائی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (الجمعۃ:۲)

''وہی ہے جس نے اُمّیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے' ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

اس لحاظ سے رسول اللہ ﷺ کے درج ذیل کام تھے:

☆ تعلیمِ کتاب دینا ☆ تشریحِ کتاب کرنا ☆ تزکیۂ نفس کرنا
☆ صالح جماعت تیار کرنا ☆ اس جماعت کی رہنمائی کرنا۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ان تمام امور پر خوب محنت کی اور حیاتِ انسانی کو درپیش جملہ عمومی مسائل کی تشریحات کر کے اپنا فریضہ ادا کیا۔ آپ ﷺ کی وفات تک اسلامی قانون کا بنیادی خاکہ مدوّن ہو چکا تھا' نیز دوسری طرف اس کے نفاذ کی عملی راہیں بھی متعیّن ہو چکی تھیں اور اس حوالہ سے ایک عملی معاشرہ تشکیل پا چکا تھا جو قانونِ اسلامی کی اصل روح سے واقف تھا اور اس کی عملی تشریحات کا اہل تھا۔

☆ استاد جامعہ قاسم العلوم گلگشت کالونی' ملتان

خلافتِ راشدہ (دوسرا دور)

فقہ اسلامی کا دوسرا دور نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد شروع ہوتا ہے اور یہ خلافتِ راشدہ کے دور سے منسوب ہے۔ اس دور میں چونکہ اسلامی فتوحات کی کثرت ہوئی اور ان فتوحات کے نتیجے میں اسلام کو مختلف تہذیب وتمدن سے واسطہ پڑا' چنانچہ بہت سے اجتماعی مسائل نے جنم لیا جن کا اسلام کو اس سے قبل واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس دور میں مسائل کے حل کے لیے دو نئے مآخذ یعنی اجماع اور قیاس کا استعمال شروع ہوا۔ اجماع کو منظم شکل دی گئی اور رائے کے استعمال کے لیے فقہی اصول وقواعد منضبط ہوئے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں چار طرح کے لوگ تھے:

☆ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا پہلا طبقہ وہ ہے جن سے بہت زیادہ روایات اور فقہی مسائل منسوب ہیں۔ یہ کسی ایک میدان کے متخصص نہیں بلکہ پورے دین کے متخصص تھے۔ بہت سے فقہی مسائل میں اپنے طبعی میلان کے باعث انہوں نے مسائل استنباط کیے ہیں اور یہ حضرات خلفاء راشدین ہیں۔

☆ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دوسرا طبقہ متخصصین کا ہے۔ اس طبقہ کو فقہی حوالے سے بہت زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ ان میں حضرت معاذ بن جبل' حضرت ابوموسیٰ اشعری' حضرت زید بن ثابت اور حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔

☆ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تیسرا طبقہ مکثرین کا ہے' یعنی جن سے بہت زیادہ تعداد میں اجتہادات اور فتاویٰ منقول ہیں۔ ان حضرات سے بڑی رہنمائی حاصل ہوئی' لیکن خود ان مکثرین کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کی تعداد بیس پچیس سے زیادہ نہیں۔(۲)

☆ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا چوتھا طبقہ مقلّین کا ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے بہت کم روایات اور مسائل و اجتہادات نقل کیے ہیں۔ ان حضرات سے چند سو کے قریب فتاویٰ نقل ہیں۔ ان کی فہرست بھی ابنِ قیمؒ نے مرتب کی ہے۔(۳)

اس دور میں استنباط صرف ان فتووں تک محدود تھا جو وہ لوگ دیتے تھے جن سے کسی واقعہ کے متعلق سوال کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ مسائل کے اثبات اور ان کے جواب میں بہت زیادہ پاؤں نہیں پھیلاتے تھے بلکہ اس کو مکروہ سمجھتے تھے اور جب تک کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو جائے اس کے متعلق اپنی رائے نہیں ظاہر کرتے تھے۔ البتہ جب مسئلہ پیدا ہو جاتا تھا تو اس کے لیے استنباطِ حکم میں اجتہاد کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کبار صحابہؓ سے جو فتوے منقول ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے۔(۴) اس دور کے مشہور فقہاء درج ذیل ہیں:

☆ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم
☆ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ
☆ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ
☆ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ
☆ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

دورِ بنی اُمیّہ (تیسرا دور)

یہ دور صغار صحابہ کرام ؓ اور تابعین کرام ؒ کا دور ہے' جو صحابہ کرامؓ کے تربیت یافتہ شاگرد تھے۔ اس کی مدّت ۴۱ ہجری سے لے کر دوسری صدی ہجری کے اختتام تک ہے۔ یہ دور فقہ اسلامی کا تاسیسی دور کہلاتا ہے' کیونکہ اس میں فقہ کی تدوین کا باقاعدہ کام شروع ہوا۔ بقول مولانا تقی امینیؒ فقہ کی ترتیب وتدوین کا پورا مسالہ اسی دور میں تیار ہوا تھا۔ اسی بنا پر اس کو ترتیب وتدوین کا تاسیسی دور کہنا زیادہ مناسب ہے (۵) اس دور میں جہاں فقہ اسلامی کی باقاعدہ تدوین کا عمل جاری ہوا وہیں کئی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔

مسلمانوں میں باقاعدہ فرقہ بندیاں وجود میں آئیں۔ ہر فرقہ کے رجحانات ومیلانات دوسرے سے مختلف تھے۔ چنانچہ بعض اسلاف کو بعض پر فوقیت دینے کا رجحان پیدا ہوا اور بہت سے فروعی مسائل میں اختلاف رونما ہوئے۔

اس دور میں روایتِ حدیث کی رکاوٹ ختم ہوگئی' چنانچہ روایت حدیث کا عام رواج ہوا' جس کی وجہ سے دُور دُور سے لوگ فتویٰ اور تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے علماء وفقہاء کی طرف متوجہ ہوئے۔ روایت حدیث اور ان سے مسائل کے استخراج کے لیے باقاعدہ منظم طریقہ کار اپنایا گیا۔ اس دور میں روایت حدیث کا اندازہ اس عبارت سے ہوسکتا ہے:

> ''اس دور کے اصحابِ فتاویٰ سے حدیثوں کی ایک بہت بڑی تعداد روایت کی جاتی ہے۔ چنانچہ ان میں بعض مفتیوں کی حدیثیں ہزاروں سے زیادہ ہیں۔ مثلاً مسندِ ابی ہریرہؓ ۳۱۳ صفحوں میں' مسندِ عبداللہ بن عمرؓ ۱۵۶ صفحوں میں لکھا ہوا ہے۔ (اس کے برعکس) مسندِ ابی بکرؓ ۴ صفحوں میں' مسندِ عمرؓ ۴۱ صفحوں پر اور مسند علیؓ صرف ۸۵ صفحوں پر آیا ہے۔''(۶)

مرکز میں پہلی جیسی جاذبیت باقی نہ رہی' اس لیے فقہ میں مختلف علاقوں کے فقہاء کی بات چلنے لگی۔ اسی طرح غیر عرب یعنی عجمی لوگوں کی ایسی جماعت تیار ہوگئی جو اپنی صلاحیتوں اور قابلیت کے لحاظ سے عربوں سے کم نہ تھی۔ اس حوالہ سے مولانا تقی امینی لکھتے ہیں:

> ''یہ حضرات اپنی صلاحیت کے لحاظ سے عرب کے مقابلہ میں کم نہ تھے' بلکہ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ فقہ روایت میں عجم کا حصہ عرب سے زیادہ ہے۔ اگر زیادہ نہ بھی ہو تو برابر کی شرکت میں کوئی کلام نہیں۔''(۷)

رائے اور حدیث کے استعمال کرنے میں اختلاف ہوا جس کی بنا پر دو مختلف گروہ بن گئے۔ ایک گروہ دستیاب احادیث کے مطابق فتویٰ دیتا تھا' اسے اہل الحدیث کا گروہ کہا جاتا ہے اور دوسرا گروہ مسائل شریعہ کے حل کے لیے قیاس اور رائے کا کثرت سے استعمال کرتا تھا' اسے اہل الرائے کہا جاتا ہے۔ اہلِ حجاز کا رجحان پہلے گروہ کی طرف تھا اور اس کا مرکز مدینہ تھا' جبکہ دوسرا گروہ اہلِ کوفہ کا تھا اور ان کا مرکز کوفہ تھا۔ اس دور کے مشہور فقہاء درج ذیل تھے:

☆ اُم المومنین حضرت عائشہ ؓ ☆ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ ☆ حضرت ابو ہریرہ ؓ

☆ حضرت سعید بن المسیب ؒ ☆ حضرت عروہ بن زبیر ؒ ☆ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ
☆ حضرت مجاہد بن جبیر ؒ ☆ حضرت عکرمہ ؒ ☆ حضرت علقمہ بن قیس ؒ
☆ حضرت مسروق بن الاجداع ؒ ☆ حضرت سعید بن جبیر ؒ ☆ حضرت انس بن مالک ؒ

دور بنی عباس (چوتھا دور)

بنوامیہ کے بعد بنوعباس کا دور آیا جو تقریباً آٹھ سو سال پر محیط ہے۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسلامی علوم وفنون کی ترقی اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ چنانچہ دیگر علوم وفنون کی طرح فقہ اسلامی بھی اسی دور میں باقاعدہ باضابطہ مدوّن ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ اصولِ فقہ کی جزئیات بھی اپنی حتمی شکل اختیار کر گئیں۔ اس دور کو فقہ اسلامی کا روشن دور کہا جاسکتا ہے۔ اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور کے فقہاء کے مرتب کردہ فقہی مسائل اور جزئیات پر آج تک عمل ہو رہا ہے۔

اس دور کی فکری وشعوری داغ بیل تو تیسرے دور ہی میں پڑ چکی تھی' لیکن فقہ کی باقاعدہ تدوین اسی دور میں ہوئی۔ اس دور میں اسلامی سلطنت بڑے وسیع رقبے پر پھیل چکی تھی۔ چنانچہ سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ تہذیب وتمدّن بھی وسعت اختیار کرتی چلی گئی' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے جدید مسائل ابھر کر سامنے آئے۔ ان مسائل کے حل کے لیے صحابہ کی تیار کردہ جماعت ''تابعین'' اور ان کے صحبت یافتہ ''تبع تابعین'' نے انتہائی محیّر العقول کارنامے سرانجام دیے اور اسلامی قانون کا کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑا۔ مجموعی حیثیت سے یہ دور علمی وفکری حرکت کا دور تھا۔ کئی قومیں اسلام لائیں اور اس کے نتیجے میں ان قوموں کے علوم وفنون سے استفادہ کے مواقع فراہم ہوئے۔ یونانی علوم وفنون کی ترویج ہوئی اور بہت سی کتب کے تراجم بھی ہوئے۔ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے یونان کی بغاوت پر جزیہ کے طور پر ان کی کتاب منگوائیں اور ان کے تراجم کے لیے خصوصی محکمہ قائم کیا۔ اس عمل سے مسلم فکر میں وسعت پیدا ہوئی اور دنیا کی فکری حالت اور قانونی جزئیات تک رسائی ممکن ہوئی۔

اس دَور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس دور میں حدیث کی تدوین کا عمل اپنے انجام کو پہنچا۔ پہلے ادوار میں حدیث کا مکمل سرمایہ نظر کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے مسائل ادھوری اور نامکمل شکل میں موجود تھے' چنانچہ حدیث کی تدوین ہو جانے کے بعد اب یہ مشکل حل ہو گئی۔

اصولِ فقہ کی تدوین اسی دور میں مکمل ہوئی۔ بہت سے فقہی مسائل ایسے ہیں جن میں فقہاء کا آپس میں اختلاف ہے اور یہ اسی وجہ سے ہے کہ ہر امام کے فقہی اصول دوسرے سے مختلف ہیں' جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

☆ حدیث کی حجیّت اور اس سے فقہ کے استنباط میں کسی فقیہہ نے کلام نہیں کیا۔ البتہ اس کے قبول کرنے کے طریقہ میں اختلاف ہوا اور ہر فقیہہ نے اپنے اپنے معیار کے مطابق اس کے ضابطے اور طریقے مقرر کیے۔ چند آدمیوں نے حدیث ہی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا' لیکن جمہور فقہاء سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا' بلکہ انہوں نے اس پر سخت نکیر کی تھی۔ حتیٰ کہ امام شافعیؒ وغیرہ نے انکارِ حدیث کے طریقہ کو ضلالت وگمراہی کا طریقہ قرار دیا۔

☆ قیاس اور استحسان کو ماخذ قرار دینے میں اختلاف ہوا۔ محدثین نے قیاس کے زیادہ استعمال پر پابندی لگانے کی کوشش کی اور امام شافعیؒ نے استحسان کی تردید کی۔ اس میں شک نہیں کہ قیاس سے اس دور میں بہت کام لیا گیا تھا۔ احناف کا حصہ اس میں بہت زیادہ ہے۔ حنابلہ اور مالکیہ کا ان کے مقابلے میں بہت کم ہے اور شوافع کا ان دونوں کے درمیان ہے۔

☆ اجماع کی شرطوں میں اختلاف ہوا' جس کی بنا پر مسائل ثابت کرنے میں مختلف زاویہ ہائے نگاہ پیدا ہوئے۔

☆ حکم سے ثبوت کے درجہ اور طریقہ میں اختلاف ہوا' مثلاً یہ کہ کس طرح وجوبی حکم ثابت ہوتا ہے اور کس طرح غیر وجوبی حکم کا ثبوت ہوتا ہے۔ فقہاء نے اس کے قاعدے وضابطے مرتب کیے۔

☆ فقہاء نے اصولِ فقہ پر بہت سی کتابیں لکھیں اور نہایت کامیاب طریقہ پر اس فن کو مدوّن کیا' جس سے بعد کے لوگوں کو رہبری حاصل ہوئی اور اسی کو بنیاد بنا کر مسائل کا استنباط واستخراج کرتے رہے۔(۸)

تمام فقہی مذاہب جو وجود میں آئے ان کی صحیح تعداد تو اللہ کو معلوم ہے' لیکن اندازاً یہ تعداد سینکڑوں میں تھی۔ اس لیے کہ سینکڑوں بڑے بڑے فقہاء تھے جو یہ کام کر رہے تھے۔ ان میں سے جن جن کو اسباب اور سہولتیں میسّر آگئیں ان کی فقہیں باقی رہیں اور جن کو یہ اسباب اور سہولتیں میسّر نہیں آئیں ان کی فقہیں ختم ہوگئیں۔(۹) بہر حال اس دور کے مشہور فقہاء' جن کی فقہیں ہم تک کلی یا جزوی طور پر پہنچی ہیں' درج ذیل ہیں:

☆ فقہ حنفی (مؤسس امام ابوحنیفہؒ) ☆ فقہ مالکی (مؤسس امام مالکؒ)
☆ فقہ شافعی (مؤسس امام شافعیؒ) ☆ فقہ حنبلی (مؤسس امام احمد بن حنبلؒ)
☆ فقہ جعفری (مؤسس امام جعفر صادقؒ) ☆ فقہ اباضی (مؤسس امام عبداللہ بن اباضؒ)
☆ فقہ زیدی (مؤسس امام زید بن علیؒ) ☆ فقہ ظاہری (مؤسس امام داؤد ظاہریؒ)
☆ فقہ طبری (مؤسس امام جعفر طبریؒ) ☆ فقہ اوزاعی (مؤسس امام اوزاعیؒ)

ان میں سے آخری دو فقہیں زیادہ عرصہ نہ چل سکیں اور ایک دوسرے میں ضم ہوگئیں۔ مثلاً فقہ اوزاعی فقہ حنفی میں ضم ہوگئی اور فقہ طبری فقہ شافعی میں مدغم ہوگئی۔ اب ان میں سے اکثر کا ذکر صرف کتابوں میں ملتا ہے جبکہ بقیہ آٹھ اس وقت بھی دنیا میں رائج ہیں۔

اس دور میں بہت سے جید اور بالغ نظر فقہاء ہوئے ہیں' لیکن چار فقہاء کو خصوصی شہرت نصیب ہوئی:

(۱) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (۲) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ
(۳) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (۴) امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

یہ امام وہ ہیں جن کے مسلک نے شہرت حاصل کی' ان کی فقہ مدوّن کی گئی اور باقی رہی۔ مولانا تقی امینی رحمۃ اللہ علیہ نے ان فقہاء کی شہرت کے درج ذیل اسباب بیان کیے ہیں:

☆ ان حضرات کی تمام رائیں جمع کر لی گئی تھیں۔ پہلے دور کے لوگوں کو یہ بات حاصل نہ تھی۔ اس بنا پر مستقل رائے کی حیثیت سے ان کے مقابلہ میں ان کو شہرت حاصل نہ ہوئی۔

☆ ان کے شاگردوں کو سوسائٹی میں اونچا درجہ حاصل ہوا۔ پھر جب انہوں نے اپنے استادوں کی رائیں نقل

کیں تو وہ نہایت وقعت کی نظر سے دیکھی گئیں۔

☆ شاگردوں نے ان کی رائے کی اشاعت وحمایت میں کافی زور لگایا۔

☆ بعض مسلک اپنی وسعت اور ان میں ضرورتوں کے زیادہ پوری ہونے کی وجہ سے حکومت کے قانون بن گئے۔(۱۰)

اس دور کے مشہور فقہاء درج ذیل ہیں:

☆ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (۸۰۔۱۵۰ھ)
☆ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ (۹۳ھ۔۱۷۹ھ)
☆ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (۱۵۰۔۲۰۴ھ)
☆ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (۱۶۴ھ۔۲۴۱ھ)
☆ امام طبری رحمۃ اللہ علیہ (۱۷۰ھ۔۲۴۸ھ)
☆ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ (۸۸ھ۔۱۵۷)
☆ امام داؤد بن علی ظاہری رحمۃ اللہ علیہ (۲۰۲ھ۔۲۷۰ھ)
☆ امام ابن حزم اندلسی رحمۃ اللہ علیہ (۳۸۴ھ۔۴۵۶ھ)
☆ امام سفیان بن سعید ثوری رحمۃ اللہ علیہ (۹۷ھ۔۱۶۱ھ)
☆ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۳ھ۔۱۸۲ھ)
☆ امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۲ھ۔۱۸۹)
☆ امام زفر بن ہذیل رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۰ھ۔۱۵۸ھ)
☆ امام حسن بن زیاد کوفی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۰۴)
☆ امام زید بن علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۲ھ)
☆ امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۹۰ھ)
☆ امام عبداللہ بن اباض رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۸۰ھ)

جمود وتقلید کا دور (پانچواں دور)

عہد عباسی کے آخری ادوار میں علم فقہ کی ترقی رک گئی۔ یعنی فقہ میں استقلال کی روح سیاسی ضعف کی تقلید میں ضعیف ہوگئی۔ چنانچہ اس دور کے فقہاء نے تدوینِ مذہب پر اکتفا کیا اور ان کا اجتہاد احکام فرعیہ تک محدود ہوکر رہ گیا۔ نیز ان کا کام صرف متقدمین کی کتب کی شروح اور حواشی لکھنا رہ گیا۔ ساتویں صدی کے وسط میں تمام فقہاء اس پر متفق ہوگئے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا ہے اور مذاہبِ اربعہ ہی ان کے لیے کافی ہیں۔ اس طرح عربی تمدن کو تدریجاً زوال کا سامنا کرنا پڑا اور ہر طرف جمود چھا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طرف تقلید پھیل گئی اور فقہی اجتہاد رک گیا۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں:

''گزشتہ تین سو سال کے دوران جس طرح مسلمانوں کے دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں ایک جمود اور انحطاط پیدا ہوا ہے اسی طرح فقہ اسلامی میں ان کی فہم اور فقہ اسلامی کے بارے میں ان کے رویہ میں بھی جمود اور انحطاط نے جگہ پائی ہے۔''(۱۱)

مسلمانوں کے اجتماعی زوال نے جہاں ان کی اقدار، تہذیب وتمدن اور وقار کی دھجیاں اڑائیں وہیں علوم و فنون کی ترقی میں بھی رکاوٹ آگئی۔ چنانچہ فقہ اسلامی بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی اور اس میں تقلید و جمود کے جراثیم پیدا ہونے لگے۔

''ساتویں صدی ہجری میں جب بغداد کی دنیوی شان وشوکت اور دینی وجاہت پر زوال آیا تو وہاں کی علمی سرگرمیاں بھی مدہم پڑنے لگیں اور عربوں کی تہذیب بھی آمادۂ زوال ہوگئی۔ یہ وہ وقت تھا جب سُنّی علماء

نے متفقہ طور پر اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دینے کا فیصلہ کر دیا اور اپنے لیے سُنّیوں کے چار مذہب یعنی فقہ مالکیہ' فقہ شافعیہ' فقہ حنفیہ اور فقہ حنبلیہ کو کافی سمجھ لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی فکر کی ترقی کے آگے ایک نا قابل عبور دیوار حائل ہوگئی اور اسلامی فلسفہ قانون نیز دیگر علومِ اسلامی پر جمود اور تقلید و نقالی کی مہریں لگ گئیں۔''(۱۲)

اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اجتہاد کی حرکت رک گئی اور علمائے فقہ اگلے مجتہدین کے مذہبی دائروں میں محدود ہو کر رہ گئے۔ یہ صورت مذاہبِ اربعہ میں خاص طور سے رونما ہوئی۔ ان کے الگ الگ علاقائی مرکز پیدا ہو گئے اور فقہائے وقت کی علمی سرگرمیاں شروحات اور تنقیحات تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ اس علمی جمود کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ فقہ میں بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے۔

اس موقع پر اسی دور کے عالم علامہ ابن قیم الجوزی رحمۃ اللہ علیہ بھی کہہ اٹھے کہ:

''فقہ اسلامی میں بعض ایسی مشکلات' دقتیں اور لاینحل مسائل پیدا ہو گئے ہیں جو کسی بھی فلسفہ قانون کے شایانِ شان نہیں کہلا سکتے۔''(۱۳)

مسلمانوں میں فکری جمود کی یہ کیفیت کیوں پیدا ہوئی اور اجتہاد کا دروازہ کیونکر بند کر دیا گیا؟ ان سوالات پر ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقا رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''اس دور کے نصف اول میں مذاہب اربعہ کے علماء نے باب اجتہاد بند کرنے کا فتویٰ صادر کیا۔ اس لیے کہ اجتہادی اہلیت کے لیے جن اعلیٰ صفات اور جس شرعی ولغوی قابلیت اور رسوخ علمی کی ضرورت تھی علماء میں اس کا فقدان ہو گیا تھا اور عوام کا شعور اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ وہ یہ تمیز نہ کر سکتے تھے کہ کون لائق تقلید ہے اور کون نہیں۔ علماء نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ ممکن ہے آگے چل کر بعض جاہل اور ہوا پرست لوگ مدعیانِ علم بن کر مسندِ اجتہاد بچھا بیٹھیں اور فقہ کی اس عالی شان عمارت کو نقصان پہنچائیں جس کی تعمیر صحیح عملی اصول پر ائمہ عظام کے ہاتھوں مکمل ہوئی ہے۔''(۱۴)

اس حوالہ سے علامہ خضری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''جس دور میں اجتہاد کا دروازہ بند کیا گیا اس وقت اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس وقت اگر ایسا نہ کیا جاتا تو بیسیوں مدارسِ خیال پیدا ہو جاتے اور باہم سخت تصادمات ہوتے اور ہر شخص مجتہد بن کر گمراہی پھیلاتا۔ ایسی حالت میں اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کا یہ فائدہ ہوا کہ امت زیادہ انتشار سے بچ گئی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کبھی کسی معاملے میں اجتہاد کی ضرورت ہی نہیں۔''(۱۵)

اس دور کے فکری جمود کی وجوہات اور اسباب درج ذیل ہیں:

(۱) جن علماء مجتہدین نے سابق میں اپنے علم و عقل کے نور سے دنیا کو منور کیا تھا ان کے تلامذہ اپنے اپنے شیوخ کے اقوال کو پتھر کی لکیر سمجھنے لگے اور تعصّب کا خاصہ یہ ہے کہ انسان اس کی وجہ سے ایک ہی نظریہ پر اَڑ جاتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کے قبول کرنے پر مجبور کرتا ہے اور اس کے مقابل دوسری چیز ہرگز نہیں سنتا۔ ائمہ سابقین کے بعد ان کے پیرو بھی تعصّب میں مبتلا ہو گئے۔ وہ صرف اپنے مسلک کے مطالعہ اور اسی کی اشاعت میں مصروف رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے اکابر کے طرزِ تفکر اور اجتہاد کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ اس کا یہ اثر

ہوا کہ اہل علم خود اعتمادی سے محروم ہو گئے اور ہر مسئلہ میں متقدمین پر اعتماد اور اپنے اوپر شک کرنے لگے۔

(۲) شروع میں خلفاء کا طریقہ یہ تھا کہ عہدۂ قضاء کے لیے صاحب اجتہاد علماء کو منتخب کرتے تھے اور مقلّدین کو یہ عہدہ نہیں دیا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں اس کو تبدیل کر دیا گیا یعنی مقلدین کو ترجیح دی جانے لگی' تاکہ ایک معیّن مذہب کے پابند رہ کر اجرائے احکام میں مددگار ثابت ہوں اور کوئی فیصلہ اس مذہب کے خلاف نہ کر سکیں۔ نیز اس امکان کے پیش نظر بھی کہ مجتہد قاضی کی رائے اور اس کے فیصلہ پر اہلِ مذہب فقہاء کو نکتہ چینی کرنے کا موقع ملے گا' جس سے عوام کا اطمینان درہم برہم ہوگا' اور چونکہ خلیفہ خاص طور سے اپنے پسندیدہ مسلک کے آدمی کو قاضی مقرر کرتا تھا اس لیے عوام اسی کو کافی سمجھتے اور اسی کی طرف رجوع کرتے تھے۔

(۳) ہر مسلک کے مسائل و احکام کی تدوین سے لوگوں کو یہ فائدہ ہوا کہ اس سے ہر شخص بآسانی مستفید ہونے لگا اور لوگوں کی فطرت ہے کہ مشکل کو چھوڑ کر ہمیشہ آسان چیز کی طرف دوڑتے ہیں۔ ابتدائی زمانہ میں پیش آمدہ واقعات کے متعلق احکامِ شریعت نہ ملتے تو مجبوراً لوگ اجتہاد سے کام لیتے تھے' مگر جب حضراتِ مجتہدین نے اس بارِ عظیم کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر ہر قسم کے واقعات پر جو وقوع پذیر ہوئے یا ان کے آئندہ واقع ہونے کا احتمال تھا' احکام مدوّن و مرتب فرما دیے تو لوگوں کا یہ حال ہو گیا کہ جب کسی مسئلہ کی ضرورت پیش آتی اور علماء سابقین کی کتابوں میں اس کا حکم مل جاتا تو بس انہی کے اقوال پر اکتفا کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان میں بذاتِ خود مسئلہ کی تحقیق و تجسّس کا جذبہ پیدا نہ ہوتا تھا۔

(۴) متقدمین کی علمی عظمت' ان کا زمانی تقدم اور عوام میں اسلاف پرستی کا مادہ بھی بابِ اجتہاد کی بندش میں سازگار ثابت ہوا۔[۱۶]

اس دور میں مذہبی مناظروں نے دنگل کی شکل اختیار کر لی۔ اپنے مسلک کے مناقب اور دوسرے کے مسلک پر کیچڑ اچھالنا علماء کا طرۂ امتیاز بن گیا۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقاؒ فرماتے ہیں:

> ''فقہی مسائل میں بحث و مناظرہ کی شدّت و عصبیّت کا یہ اثر ہوا کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا علماء کی طبیعتوں سے تسامح اور علمی قدردانی' جو اسلاف کا طرۂ امتیاز تھی' ختم ہوگئی اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ بعض اہلِ مذہب نے مذہبی تقلید کے صحیح ہونے کی یہ شرط بیان فرمائی کہ مقلد کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ اس کے امام کا مذہب صحیح ہے' اس میں غلطی کا صرف احتمال ہے اور دوسرے امام کا مذہب خطا ہے اور اس کے صحیح ہونے کا صرف احتمال ہے۔''[۱۷]

(۵) ایک طرف تو مسلمانوں کی روشن کردہ قندیلیں ان کی اپنی غفلت و کوتاہی کے باعث بجھ رہی تھیں تو دوسری طرف مغرب میں علم و فن کا نیا سورج اُبھر رہا تھا۔ دیگر قوموں کے علوم و فنون سے مسلمانوں کو عہدِ عباسی کے آغاز میں بھی واسطہ پڑا تھا' لیکن اب صورتحال مختلف تھی۔ پہلے مسلمان حاکم تھے اور اب محکوم۔ اسی محکومیت نے مغرب کے لادینی اثرات کو بہت جلد قبول کر لیا۔ بقول مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ جن مسلمان ملکوں میں مغربی قوموں کا عملاً تسلّط قائم ہو گیا وہاں تو اسلامی قوانین کا پڑھنا پڑھانا بھی محض عربی مدرسوں میں بطور تبرّک ہی رہ گیا۔[۱۸] اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ آہستہ آہستہ اسلامی فقہ محض کتابوں کی

زینت بن گئی اور اس کے نفاذ کی عملی جِدّوجُہد سے مسلمانوں کو مایوس کر دیا گیا۔

ان تمام اسباب سے قطع نظر ہو کر اگر غور کیا جائے تو اس دور کی ایک سب سے نمایاں اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس دور میں فقہ کو باقاعدہ تدوین اور پھر اس کے بعد تحقیق وتنقید کے مراحل سے گزارا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے اشکالات دور ہو گئے اور بہت سی غلط فہمیوں کا راستہ رک گیا۔ ساتھ ہی ساتھ فقہی کتب کا ایسا شاندار ذخیرہ اکٹھا ہو گیا جس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔ اگرچہ علماء نے تقلید کا راستہ اختیار کرتے ہوئے متقدمین کی کتابوں کی شروحات لکھنے پر ہی اکتفا کیا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے پیش رو اتنا بڑا کام کر گئے تھے کہ اس کو سنبھالنے کے لیے بھی طویل وقت اور محنت شاقہ درکار تھی جو ان حضرات نے باحسن نبھائی۔ چنانچہ اس دور کے فقہاء نے اپنی شروحات میں متقدمین کے کام کا انتہائی باریک بینی سے جائزہ لیا اور اسی باریک بینی اور ژرف نگاہی کا نتیجہ نکلا کہ غلط فہمی کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی اس حوالہ سے لکھتے ہیں:

> ''فقہاء نے جو اجتہادات کیے تھے اور پہلی اور دوسری صدی ہجری میں جو فقہی مسالک قائم ہوئے تھے ان کے ایک ایک پہلو اور ایک ایک لفظ پر اتنی کثرت سے غور کیا گیا' اتنی باریک بینی سے ایک ایک چیز کا جائزہ لیا گیا کہ کسی چیز میں کسی غلط فہمی کا امکان نہیں رہا۔ کسی ایک رائے کو جب کئی سو سال تک غور وخوض کا موضوع بنایا جائے گا تو اس میں کسی غلطی اور الجھن کا امکان بہت کم رہ جائے گا اور ہر چیز بہت واضح اور منقح ہو کر سامنے آجائے گی۔''(۱۹)

لیکن بدقسمتی یہ رہی کہ ان کے بعد کے علماء وفقہاء نے اسی کو اپنا وطیرہ بنا لیا اور اسی کو متقدمین کی محنت کا مقصد ومنشا سمجھنے لگے۔ چنانچہ تقلید اور جمود کا یہ عرصہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا اور عصری تقاضوں کے مطابق فقہ اسلامی کی جزئیات کی عملی تطبیق نہ ہونے کے باعث مسائل اور مشکلات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

دورِ حاضر (فقہ کا چھٹا دور)

اس دور کا آغاز آٹھویں صدی ہجری سے ہوتا ہے جب فقہ حنبلی کے علماء علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے شاگرد علامہ ابن قیم رحمہ اللہ جیسے عبقری شخصیت کے مالک حضرات نے اجتہاد کے حوالہ سے اپنے افکار وخیالات سے لوگوں کو متاثر کیا۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تقلید جامد کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے صدیوں پرانی اجتہادی مساعی کی یاد تازہ کر دی۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے قلم نے تقلید وجمود کی دیواریں گرانے میں گرز البرز کا کام کیا۔ ان کے بعد ان کے شاگردوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور ان کے افکار ونظریات کو باقاعدہ مرتب کر کے چہار دانگ عالم میں پھیلا دیا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پڑھے لکھے طبقہ میں جمود کی کیفیت کم ہوئی اور اذہان از سرِ نو حالات وزمانہ کی رعایت سے فقہی جزئیات پر سوچنے پر آمادہ ہوئے۔

ہندوستان میں یہ سہرا حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی تجدیدی مساعی سے فقہ اسلامی کو اس کی اصل روح کے مطابق زندہ کیا۔ ان کے بعد ان کی قابل اور ذی استعداد اولاد نے یہ کام باحسن نبھایا۔ اسی طرح محمد بن عبدالوہاب نجدی' سید جمال الدین افغانی اور ان کے بعد ان کے قابل

قدر شاگرد شیخ مفتی محمد عبدہ اور پھر ان کے بعد ان کے شاگرد سید رشید رضا لبنانی ؒ نے اسے نئی جہتیں عطا کیں۔

اسلامی فقہ کے احکام تمام اجتہادی کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کو اکٹھا کر کے ایک فقہی کتاب کی شکل میں مدون کیا گیا اور اس کام کی نگرانی سلطنتِ عثمانیہ کے زیر سایہ ہوئی۔ اس کتاب کا نام ''**المجلة الاحکام العدلیه**'' رکھا گیا اور سلطنتِ عثمانیہ نے اپنی سلطنت میں اسے رائج کر دیا۔ اس کا آغاز ۱۸۵۶ء میں ہوا اور ۱۸۷۶ء میں یہ کام مکمل ہو گیا۔ اس کتاب کو سولہ حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور جملہ فقہی مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ سلطنت عثمانیہ کا پہلا مدون اور کوڈیفائنڈ سول لاء تھا جو فقہ اسلامی سے بالعموم اور فقہ حنفی سے بالخصوص ماخوذ تھا۔ کہیں کہیں اس میں فقہ حنفی سے ہٹ کر دوسرے فقہاء کے اقوال بھی لیے گئے تھے (۲۰)۔ اس کام کے بہت دور رس نتائج برآمد ہوئے اور فقہ اسلامی ایک جدید دور میں داخل ہو گئی۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر محمود احمد غازی فرماتے ہیں:

> ''جب بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو مجلۃ الاحکام العدلیہ پوری سلطنتِ عثمانیہ میں نافذ العمل تھا۔ اس زمانہ میں سلطنت عثمانیہ کی حدود مشرقی یورپ کے کئی ممالک، ترکی، وسط ایشیا کا کچھ حصہ، عراق، شام، فلسطین، لبنان، الجزائر، لیبیا، تیونس اور جزیرہ عرب کے بعض علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہم بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ ۱۸۷۶ء سے لے کر ۱۹۲۵ء تک کا زمانہ **مجلة الاحکام العدلیه** کی حکمرانی کا زمانہ تھا۔''(۲۱)

سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کے بعد اس پر عمل بند ہو گیا اور یورپی قوانین نے اس کی جگہ لے لی۔ ۱۹۴۰ء کے اواخر میں عرب دُنیا میں اس سوچ نے اہمیت اختیار کی کہ فقہ اسلامی کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے اور اسے دستوری حیثیت دی جائے۔ یہ وہ دور تھا جب مختلف عرب ممالک ایک ایک کر کے الگ ہو رہے تھے اور آزادی کی نعمت سے ہمکنار ہو رہے تھے۔ ان حالات میں ان فقہائے کرام نے جو طویل عرصہ سے فقہ کی جدید تدوین کے حوالہ سے کام کر رہے تھے ان نو زائدہ ممالک سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ مغربی قوانین کی جگہ فقہ اسلامی کو رواج دیں اور نافذ کریں۔

چنانچہ مصر میں استاد عبدالقادر عودہ شہید ؒ نے اس موضوع پر کتاب لکھی جس کا نام ''**التشریع الجنائی الاسلامی مقارناً بالتشریع الوضعی**'' رکھا۔ اس کتاب میں اسلامی فوجداری قانون کا بڑے محققانہ انداز میں جائزہ لیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقا ؒ نے بھی اپنے منفرد ذہن کی بنا پر اس حوالہ سے کام کیا اور طویل جدوجہد اور محنتِ شاقہ کے بعد فقہ اسلامی کا ایک عالی شان انسائیکلوپیڈیا تیار کیا جسے کویت کی وزارت اوقاف نے ۴۰ مجلدات میں شائع کیا ہے۔ اس انسائیکلوپیڈیا میں فقہ اسلامی کی تمام جزئیات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور اس کا نام ''**موسوعة الفقه الاسلامی**'' ہے۔ یہ کام تیس چالیس سال کی مسلسل محنت کے بعد مکمل ہوا ہے اور اس میں عرب دنیا کے بہترین فقہی دماغ استعمال ہوئے ہیں۔ بھارت کے اہلِ علم نے اسلامی فقہ اکیڈمی کے زیر انتظام اسی بے مثال کتاب کی بیشتر جلدوں کا اردو ترجمہ کر ڈالا ہے جو زیر طبع ہے (۲۲) اس طرز پر مصر نے بھی کام کیا اور ''**الموسوعة الفقه الاسلامی**'' کے نام سے دس جلدوں پر مشتمل موسوعہ طبع کیا ہے۔ اگرچہ یہ کتاب بھی عمدہ ہے لیکن استفادہ کے لحاظ سے کویت کا موسوعہ زیادہ عمدہ ہے۔

اب ہم اس دور کے عمومی فقہی رجحانات اور خصوصیات کا خلاصہ اور جائزہ درج ذیل نکات کی صورت میں پیش کرتے ہیں:

یہ دور دراصل پانچویں دور کے جمود کے خلاف شدید ردِّعمل کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ اس دور نے مجموعی طور پر اُمتِ مسلمہ کو یہ دعوت دی کہ مسلمانوں کے فکری جمود نے انہیں شریعت کی اصلی روح سے دور کر دیا تھا' چنانچہ اسے پھر زندہ کرنا از حد ضروری ہے۔ اس فکر نے لوگوں کو فکر و شعور سے کام لینے پر آمادہ کیا اور ان کے شعور کی سطح پر نمایاں تبدیلی آئی' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مکمل طور پر فکری جمود ختم تو نہ ہوا' لیکن اس کی بنیادوں پر کاری ضرب لگی اور اس حوالہ سے غور و فکر کرنے والے اور سوچنے والے لوگوں کی جماعت پیدا ہوئی جنہوں نے اس عظیم مقصد میں اپنا نمایاں کردار ادا کیا۔

اس دور کے مجددین فقہ نے تقلید کی پرزور نفی کی اور کسی ایک فقہ کو قرآن و حدیث کا درجہ دینے کی صریح مخالفت کی۔ شریعتِ اسلامی کے مصالح اصلیہ سے از سرِ نو رجوع کر کے بدعات و خرافات کو دور کرنے کی بڑی شدت سے کوشش کی گئی۔ اس حوالہ سے عرب ریاستوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے مکمل وسائل اس مقصد کے لیے استعمال کیے۔ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد ان کے قابل قدر شاگردوں نے اور اسی طرح شیخ عبدالوہاب نجدی رحمۃ اللہ علیہ نے تقلید کے خلاف بہت کام کیا۔

اس دور میں فقہی وحدت کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا گیا۔ چونکہ ہر بڑے فقہی مسلک میں کامل اتفاق رائے نہیں پایا جاتا تھا چنانچہ کوشش کی گئی کہ ہر مسلک کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ایک عمومی فقہ تشکیل دی جائے جس میں ہر مسلک سے برابری کی سطح پر استفادہ کیا جائے۔ لیکن چونکہ اس عمل کے لیے آزاد فکری فضا مہیا نہیں ہو پائی اس لیے یہ کوشش بارآور ثابت نہ ہو پائی' لیکن اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس حوالہ سے سوچنے والے لوگوں کی ایک کھیپ تیار ہو گئی۔

مسلمان ریاستوں بالخصوص عرب ریاستوں نے جدید فقہی مسائل کے حل کے لیے بہترین فقہی دماغوں کو اس مقصد کے لیے وسائل مہیا کیے۔ لیکن اس کا ایک نقصان بھی ہوا کہ فقہ اسلامی کے حوالہ سے جو آزادیٔ فکر چاروں فقہی مسالک کے بانیوں کو مہیا تھی' وہ اس دور میں حاصل نہ ہو سکی اور یہ فقہی کام حکومتوں کے زیر سایہ مکمل ہونے کے باعث وہ درجہ نہ پا سکا جو مسالک اربعہ کو حاصل ہوا۔

اس دَور کا ایک تاریک پہلو یہ بھی ہے کہ صحیح الخیال اور ذی استعداد لوگوں کی دیکھا دیکھی بہت سے نااہل اور دینی بصیرت سے محروم لوگ بھی اس میدان میں اتر آئے' جس سے فقہ اسلامی کو فائدہ پہنچنے کی بجائے نقصان پہنچا اور فروعی معاملات سے ہٹ کر اصولی معاملات میں بھی دخل اندازی شروع ہو گئی اور رائے کا دخل بہت زیادہ ہو گیا' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحیح الخیال اور فقہی بصیرت رکھنے والا طبقہ اپنا ذہنی سرمایہ ان کا رد کرنے پر صرف کرنے لگا اور اصل مقصد سے پسپائی اختیار کرتا چلا گیا۔

جہاں ایک طرف تقلید کے خلاف علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگردوں نے طویل جدّوجُہد کی وہیں ان کے بعد ان کے پیش رو انہی کی تقلید کو حتمی سمجھنے لگے اور ان کے اقوال کی شروحات کرنے میں وقت صرف

کرنے لگے۔ اسی طرح شیخ عبدالوہاب نجدی رحمۃ اللہ علیہ جو تمام عمر تقلید کے خلاف برسرِ پیکار رہے ان کے اقوال کو قرآن وسنت کے بعد تیسرا درجہ دینے لگے۔ اور اس عمل میں اس درجہ شدّت سے کام لینے لگے کہ فقہائے اربعہ کے خلاف ایک نئی فضا کو جنم دیا گیا۔ گویا تقلید کو ترک کرتے کرتے خود مقلّد بن گئے۔

بہرحال ان تمام تر باتوں کے باوجود سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ فقہ اسلامی میں عام بیداری پیدا ہوچکی ہے اور عالمِ اسلام کی فضا اس کے لیے کافی حد تک ہموار اور متوازن ہوچکی ہے۔ اگر اس کا رُخ کسی غلط سمت نہ مڑ گیا تو کوئی وجہ نہیں کہ فقہ اسلامی کا ایک نیا دور شروع ہو جو دنیا کی تاریخ میں سورج کی طرح ہمیشہ چمکتا رہے۔

حوالہ جات

(۱) مولانا محمد تقی امینی نے چار ادوار کا ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو ''فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر''، ص ۴۰۔
(۲) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، محاضراتِ فقہ، ص ۲۲۳۔
(۳) ایضاً۔
(۴) ندوی، عبدالسلام، تاریخ فقہ اسلامی، ص ۱۴۶۔
(۵) امینی، محمد تقی، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، ص ۴۵۔
(۶) ندوی، عبدالسلام، تاریخ فقہ اسلامی، ص ۱۶۹۔
(۷) امینی، محمد تقی، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، ص ۴۶۔
(۸) ایضاً، ص ۵۳۔
(۹) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، محاضرات فقہ، ص ۲۴۸۔۲۴۷۔
(۱۰) امینی، محمد تقی، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، ص ۵۵۔
(۱۱) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، محاضرات فقہ، ۵۱۶۔
(۱۲) صبحی محمصانی، اسلامی فلسفہ قانون کی جدید تشکیل، چراغ راہ (اسلامی قانون نمبر ۱۹۸۵ء) ج ۲، ص ۳۸۔۳۹۔
(۱۳) ایضاً۔
(۱۴) زرقا، مصطفیٰ احمد، ڈاکٹر، اسلامی قانون کا تاریخی ارتقاء، چراغ راہ (اسلامی قانون نمبر ۱۹۵۸) ج ۱، ص ۳۶۵۔
(۱۵) پھلواروی، محمد جعفر، اجتہادی مسائل، ص ۳۴۔
(۱۶) محمد ابوزہرہ، الملکیۃ ونظریۃ العقد فی الشریعۃ الاسلامیۃ، ص ۳۸۔۳۹۔
(۱۷) زرقا، مصطفیٰ احمد، ڈاکٹر، اسلامی قانون کا تاریخی ارتقاء، چراغ راہ (اسلامی قانون نمبر ۱۹۵۸ء) ج ۱، ص ۳۶۵۔
(۱۸) اصلاحی، امین احسن، چراغِ راہ (اسلامی قانون نمبر ۱۹۵۸ء) ج ۲، ص ۲۸۰۔
(۱۹) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، محاضرات فقہ، ص ۴۸۳۔
(۲۰) ایضاً، ص ۵۲۱۔
(۲۱) ایضاً۔
(۲۲) ایضاً، ص ۵۳۰۔

قسطوں پر خرید و فروخت

حافظ نذیر احمد ہاشمی

موجودہ دور میں قسطوں پر خرید و فروخت تمام اسلامی ممالک میں مروّج ہو چکی ہے۔ عوام الناس کی اکثریت اشیاءِ ضرورت کی خریداری صرف قسطوں پر ہی کر سکتے ہیں' کیونکہ اس ہوشربا مہنگائی کے دور میں نقد خریدنا ان کی طاقت و استطاعت سے باہر ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ایسی بیع کا حکم ازروئے شریعت بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اصل مسئلہ کی طرف آنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ جہاں تک مطلقاً اُدھار پر کسی شے کے بیچنے اور خریدنے کا تعلق ہے تو قرآن و حدیث کی رو سے یہ قطعاً جائز ہے۔ چنانچہ اگر بائع اور مشتری باہمی رضامندی سے ثمن کی تاجیلاً ادائیگی پر متفق ہو جائیں' بشرطیکہ میعاد مقرر ہو' تو اس کے جواز میں کسی کو کلام نہیں۔ چنانچہ فقہ کی کتابوں میں صراحت کی گئی ہے:

"صح البیع بثمن حالٍ وبثمن مؤجّل الٰی اجل معلوم"

مزید برآں اس کے جواز پر آیتِ مداینہ اور رسول اللہ ﷺ کی وہ احادیث پیش کی جا سکتی ہیں جن میں خود رسول اللہ ﷺ کے دوسروں سے اُدھار پر ضرورت کی چیزیں لینے کا واضح بیان ہے۔ چنانچہ متفق علیہ روایت ہے جس میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ ؓ کا بیان ہے:

اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ اشْتَرٰی طَعَامًا مِنْ یَھُوْدِیٍّ اِلٰی أَجَلٍ وَرَھَنَهٗ دِرْعًا مِنْ حَدِیْدٍ(۱)

''رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے کچھ غلّہ اُدھار خریدا تھا اور (اس کے ثمن کے بدلے) لوہے کی زرہ اس کے ہاں رہن رکھ دی تھی۔''

علاوہ ازیں قرآن مجید میں قرضِ حسنہ کے متعلق جو تعلیم دی گئی ہے اس سے بھی صراحتاً اس اُدھار کا جواز ثابت ہوتا ہے جس پر کوئی اضافہ نہ ہو۔ کسی ضرورت مند کو اس کی ضرورت کی چیز اُدھار پر اُسی قیمت پر دینا جو نقد کی صورت میں ہو' قرضِ حسنہ کی تعریف میں آتا ہے' جو بڑے اجر و ثواب کا حامل ہے۔

قسطوں پر خرید و فروخت کا مطلب وہ بیع ہے جس میں بائع مبیع (بیچی جانے والی شے) کو اسی وقت خریدار کے حوالے کر دیتا ہے لیکن خریدار قیمت فی الحال ادا کرنے کے بجائے طے شدہ قسطوں کے مطابق ادا کرتا ہے' چاہے قیمت بازاری قیمت کے برابر ہو یا کم و بیش۔ لیکن چونکہ عام طور پر قسطوں پر بیع میں طے شدہ قیمت بازاری قیمت کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے' چنانچہ اگر خریدار اس شے کو نقد کے بدلے بازار سے خریدنا چاہے تو مقرّرہ

قیمت سے کم قیمت پر بازار سے خرید سکتا ہے' لیکن اگر خریدار ادھار خریدنا چاہے گا تو بائع اس وقت اس کو بیچنے پر تیار ہوگا جب نقد کے مقابلے میں اس کو زیادہ قیمت وصول ہو۔ اس لیے عام طور پر قسطوں کی بیع میں نقد بیع کے مقابلے میں زیادہ قیمت مقرر کی جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ نقد کے مقابلے میں ادھار فروخت کرنے کی صورت میں قیمت میں زیادتی جائز ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں قدیم وجدید فقہاء نے بحثیں کی ہیں۔ چنانچہ علامہ شوکانی ''نیل الاوطار'' میں لکھتے ہیں:

یحرم بیع الشیء باکثر من سعر یومه لأجل النساء وقد ذهب الی ذٰلك زین العابدین علی بن الحسین والناصر والمنصور باللّٰه والهادویة والامام یحیی۔ وقالت الشافعیة والحنفیة وزید بن علی والمؤید باللّٰه والجمهور انه یجوز لعموم الأدلة القاضیة بجوازه وهو الظاهر (۲)

''کسی چیز کا اُدھار کی وجہ سے موجودہ قیمت سے زیادہ قیمت پر بیچنا حرام ہے' اور یہ زین العابدین علی بن الحسین' الناصر' المنصور باللہ' ھادویہ اور امام یحییٰ کا مسلک ہے۔ جبکہ شافعیہ' حنفیہ' زید بن علی' مؤید باللہ اور جمہور علماء کے نزدیک یہ جائز ہے۔ یہ مسلک ظاہر (قوی) ہے' کیونکہ اس کے جواز پر دلالت کرنے والے دلائل میں عموم ہے۔''

مختصر یہ کہ نقد کے مقابلے میں ادھار بیع میں قیمت زیادہ کرنا جائز ہے' بشرطیکہ عاقدین بوقت عقد بیع کے مؤجل یا معجل ہونے کے بارے میں فیصلہ کر کے کسی ایک ثمن پر متفق ہو جائیں۔ چنانچہ اگر بائع یہ کہے کہ نقد ثمن کی صورت میں مبیع مثلاً ہزار روپے اور ادھار ثمن میں بارہ سو روپے میں فروخت کرتا ہوں اور اس کے بعد کسی ایک قیمت کو طے کیے بغیر دونوں فریق علیحدہ ہو جائیں تو جهالت فی الثمن کی بنیاد پر بیع ناجائز ہوگی' لیکن اگر مجلس عقد ہی میں کسی ایک ثمن پر عاقدین کا اتفاق ہو جائے تو یہ بیع جائز ہو جائے گی۔ چنانچہ امام ترمذیؒ نے سنن الترمذی میں ''باب ما جاء فی النهی عن بیعتین فی بیعة'' محمد بن عمرو' عن ابی سلمہ' عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی سند سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ''نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم عَنْ بَیْعَتَیْنِ فِیْ بَیْعَةٍ'' کی وضاحت میں لکھا ہے:

قال ابوعیسی: حدیث ابی هریرة حدیث حسن صحیح' والعمل علی هذا عند اهل العلم وقد فسر بعض اهل العلم' قالوا بیعتین فی بیعة' ان یقول: ابیعك هذا الثوب بنقد بعشرة وبنسیئة بعشرین' ولا یفارقه علی احد البیعین' فاذا فارقه علی احدهما' فلا بأس اذا کانت العقدة علی احد منهما (۳)

''ابوعیسیٰ ترمذی کہتے ہیں کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اہلِ علم کا اس پر عمل ہے۔ جبکہ بعض اہلِ علم نے اس حدیث کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ بیعتین فی بیعة کا مطلب یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ یہ کپڑا میں آپ کو نقد میں دس روپے اور ادھار میں بیس روپے کا بیچتا ہوں اور پھر کسی ایک صورت پر اتفاق کیے بغیر دونوں علیحدہ ہو جاتے ہیں (تو یہ معاملہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک فاسد ہے' کیونکہ ثمن دو حالتوں میں متردد ہونے کی بنا پر جهالت فی الثمن کو مستلزم ہے جس کی بنا پر بیع ناجائز ہے' مگر

مدّت کے مقابلے میں ثمن کی زیادتی ممانعت کا سبب نہیں) لہٰذا اگر عقد کے وقت ہی کسی ایک حالت کی تعیین کر کے جہالتِ ثمن کا فساد دور کر دیا جائے تو پھر اس بیع کے جواز میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔''

ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کا مسلک بھی وہی ہے جو امام ترمذی نے بیان فرمایا ہے[٤] اور دلائل سے یہی مذہب راجح معلوم ہوتا ہے۔ کتاب الاصل المعروف بالمبسوط میں امام محمدؒ فرماتے ہیں:

اذا باع الرجل بيعًا فقال :هو بالنسيئة بكذا وبالنقد بكذا' كذا الى اجل كذا بكذا و كذا' فافترقا على هذا فانه لا يجوز' بلغنا عن رسول الله ﷺ انه نهى عن شرطين فى بيع قال محمد حدثنا بذٰلك ابو حنيفة رفعه الى النبى ﷺ۔

''جب اس طرح کوئی بیع کرے کہ ادھار پر اتنی قیمت ہے اور نقد پر اتنی قیمت یا ایک ماہ کی مدّت پر اس کی قیمت یہ ہے اور دو ماہ کی مہلت پر قیمت وہ ہے اور پھر کسی ایک صورت کی تعیین کیے بغیر تردّد کی حالت میں بائع اور مشتری جدا ہو جائیں تو یہ بیع ناجائز ہے' کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں شرطین سے منع فرمایا ہے اور یہ حدیث امام ابوحنیفہؒ نے مرفوعاً ہمیں بیان کی۔''

اور کتاب الحجة على اهل المدينة میں امام محمدؒ نے لکھا ہے:

قال ابو حنيفة فى رجل يكون له على رجل مائة دينار الى اجل فاذا حلت قال له الذى عليه الدين:بعنى سلعة يكون ثمنها مائة دينار نقدًا بمائة وخمسين الى اجلٍ' ان هذا جائز لانهما لم يشترطا شيئا ولم يذكرا امرا يفسد به الشراء ..... هكذا يتبايع الناس لانهم اذا اخروا ازدادوا ما بأس بهذا [٥]

''امام ابوحنیفہؒ نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا جس کے کسی دوسرے شخص کے ذمے سو دینار ایک مدت متعینہ تک واجب الادا تھے۔ جب مقررہ مدت ہوئی تو مدیون نے اس سے کہا کہ مجھے اپنی کوئی ایسی چیز جس کی نقد قیمت سو دینار ہو' ایک سو پچاس دینار میں ادھار بیچ دیں۔ اس معاملے کے بارے میں امام صاحب نے فرمایا کہ یہ جائز ہے کیونکہ دونوں (بائع اور مشتری) نے کوئی ایسی شرط اور مفسد بیع وشراء امر کا ذکر نہیں کیا ہے..... اسی طرح (ادھار کی صورت میں قیمت میں اضافہ) لوگوں کا معمول ہے کہ ادھار کی صورت میں وہ قیمت میں اضافہ کر دیتے ہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں۔''

علامہ سرخسی نے لکھا ہے:

اذا عقد العقد على انه الى اجل كذا بكذا وبالنقد بكذا اوقال الى شهر بكذا والى شهرين بكذا فهو فاسد لانه لم يعامله على ثمن معلوم ولنهى النبى ﷺ عن شرطين فى بيع وهذا هو تفسير الشرطين فى بيع [٦]

''یعنی جب عقد اس طرح کیا جائے کہ ادھار پر قیمت اتنی اور نقد پر اتنی یا ایک مہینے کی مدت پر اتنی اور دو مہینے کی مدت پر اتنی تو یہ عقد فاسد ہوگا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں ثمن میں جہالت ہے اور اس لیے بھی کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی بیع میں دو شرطوں سے منع فرمایا ہے اور شرطین فی بیع کا یہی معنی ہے (ثمن

یا مبیع میں تردّد)۔''

مندرجہ بالا معاملہ کے فاسد ہونے کی وجہ علامہ سرخسیؒ نے تردد فی الثمن بتائی ہے' جو اصولِ بیع اور نصِ صریح دونوں کے خلاف ہے' کیونکہ اس کے معاً بعد انہوں نے لکھا ہے:

وهذا اذا افترقا على هذا فان كانا يتراضيان بينهما ولم يتفرقا حتى قاطعه على ثمن معلوم واتما العقد فهو جائز لانهما ما افترقا الا بعد تمام شرط صحة العقد

''فساد اس صورت میں کہ جب بائع اور مشتری اس متردد انہ حالت میں جدا ہو جائیں۔ لیکن اگر دونوں راضی ہو گئے اور جدا ہونے سے پہلے ثمن طے کر کے عقد کو اتمام تک پہنچا دیا (چاہے ادھار والی صورت یا نقد والی صورت میں) تو پھر یہ عقد جائز ہے' کیونکہ بائع اور مشتری صحتِ عقد کی شرط (تعیین ثمن) کو پورا کر کے جدا ہوئے ہیں۔''

لہٰذا بیع کے عام اصول (تعیین مبیع و ثمن) کی خلاف ورزی بھی نہیں ہوئی اور نہ ہی حدیثِ رسول ﷺ کی۔ کیونکہ **شرطين فى بيع يا بيعتين فى بيعة** کے معنی علامہ سرخسی نے یہی بیان فرمائے ہیں کہ ثمن میں تردد ہو۔ جملہ کتب فقہیہ میں زیادۃ ثمن للأجل کے جواز کی تصریح ہے۔ ہدایہ کتاب البیوع' باب المرابحة والتولية میں ہے:

ان للاجل شبها بالمبيع الا ترى انه يزاد فى الثمن لأجل الأجل۔ وكذا فى البحر الرائق وفتح القدير وشرح التنوير والشامية وغيرها وزاد فى البحر الأجل فى نفسه ليس بمالٍ ولا يقابله شيء من الثمن حقيقةً اذا لم يشترط زيادة الثمن بمقابله قصدا ويزاد فى الثمن لاجله اذا ذكر الاجل بمقابلة زيادة الثمن قصدًا

''.....اجل (مدت) بذاتِ خود مال نہیں اور نہ ہی اس کے مقابلے میں ثمن کا کوئی حصہ آ سکتا ہے اگر اس (بائع) نے ثمن میں زیادتی کو قصداً اجل کے مقابلے میں شرط نہ قرار دیا ہو' البتہ اجل کی بنا پر ثمن میں اضافہ کیا جا سکتا ہے اگر اس نے ثمن میں زیادتی کے مقابلے میں قصداً اجل کا ذکر کیا ہے۔''

شرح الوقایہ باب المرابحہ میں ہے:

يزاد الثمن لاجل الاجل

''مدت کی وجہ سے ثمن میں زیادتی کی جا سکتی ہے۔''

النہر الفائق شرح کنز الدقائق میں ہے:

ألا ترى انه يزاد فى الثمن لاجله

باقی رہی ''ہدایہ'' کی کتاب الصلح' باب الصلح فى الدين کی عبارت ''**الاعتياض عن الاجل حرام**'' تو اس کا جواب یہ ہے کہ اجل بحکم صفت ہے۔ اس عبارت کے حاشیہ میں ہے: ''**لان الاجل صفة كالجودة**'' اور صفت کا حکم یہ ہے کہ اس کی وجہ سے قیمت میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے اور ثمن میں اضافے کا باعث بھی بنتا ہے۔ البتہ بعد البیع ظہورِ فقدانِ صفت کی وجہ سے رجوع بالنقصان جائز نہیں کیونکہ صفت تابع ہوتی ہے اور منفرداً اس کے ضمان میں اس کا استقلال لازم آتا ہے۔ مختصر یہ کہ موصوف بالصفۃ کی قیمت تو زیادہ ہوتی

ہے لیکن خود مستقلاً صفت کی قیمت نہیں ہے' جیسا کہ اموالِ ربویہ میں مبادلہ بالجنس کے وقت صفت کا اعتبار نہیں ہوتا۔ الغرض صفت کی وجہ سے ثمن میں اضافہ ہوتا ہے مگر دو صورتوں میں اس کا عوض جائز نہیں۔

(۱) رجوع بالنقصان (۲) مبادلہ بالجنس

مندرجہ بالا دونوں صورتوں میں صفت کا عوض لینا صحیح نہیں۔ متعدد عباراتِ فقہیہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ رجوع بالنقصان کے وقت صفت کا عوض وصول کرنا جائز نہیں ہے۔ مزید برآں رسول اللہ ﷺ کا اموال ربویہ کے بارے میں ارشادِ گرامی ہے' جو عام اصول ہے: ''جیدھا ورديها سواء'' یعنی جید اور ردّی کا مقابلہ برابر لینا ہوگا' جودت کے عوض زیادتی نہ دے سکتے ہو نہ لے سکتے ہو۔ بہترین کھجور کے ایک سیر کے بدلے میں معمولی کھجور کے دو سیر دینے لینے سے منع فرمایا' کیونکہ اس میں ایک سیر کے بدلے ایک سیر آ جاتا اور دوسرا سیر صفت جودت کے بدلے میں آ جاتا جو کہ ناجائز ہے' لیکن خود ہی آپ ﷺ نے ایک حیلہ بتا دیا کہ ردی کھجور کو کم قیمت پر بیچ دو' بجائے ایک سیر کے دو سیر فروخت کر دو اور پھر عمدہ کھجور زیادہ قیمت سے لے لو۔ عمدہ کھجور کی قیمت میں یہ اضافہ اسی وصف مرغوب (جودت) کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔ اس حقیقت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مرغوب شے کی قیمت نامرغوب کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ عمدہ کھجور والے کو معمولی کھجور کا ایک سیر اور ایک روپیہ بھی ساتھ دیا جائے' کیونکہ اس صورت میں یہ روپیہ یا یہ دوسرا سیر وصف جودت کے عوض ہوگا اور وصف کا عوض لینا جائز نہیں۔ لیکن عمدہ کھجور کو زیادہ قیمت پر خریدنا بالکل جائز ہے' حالانکہ یہاں بھی ثمن کی زیادتی وصف جودت کی وجہ سے ہے نہ کہ کسی اور وجہ سے۔ یہی معاملہ اجل کا ہے کہ اس کا عوض لینا جائز نہیں لیکن **لاجل الاجل ثمن** کا بڑھ جانا فطری بات ہے' شریعت نے اس کو منع نہیں فرمایا اور فقہاء نے اس کی تعبیر درج ذیل الفاظ سے کی ہے:

ان الاجل لا يقابله الثمن اور ان الثمن يزاد لأجل الاجل

ہدایہ کی اصل عبارت **كتاب الصلح** میں اس طرح ہے:

ولو كانت له الف مؤجلة فصالحه على خمس مائة حالةٍ لم يجز لان المعجل خير من المؤجل ..... فيكون بازاء ماحطه عند وذٰلك اعتياض عن الأجل وهو حرام

یعنی کسی کے کسی پر ہزار روپے ادھار ہیں اور وہ مدیون سے پانچ سو روپے حالاً پر صلح کرے تو یہ صلح جائز نہیں' کیونکہ معجّل مؤجل سے بہتر ہوتا ہے لہٰذا ہزار میں سے پانچ سو روپے (حالاً کی صورت میں) مؤجّل کو معجّل کرنے کا معاوضہ ہے جو کہ حرام ہے' کیونکہ اجل کا عوض لینا جائز نہیں۔

مندرجہ بالا صلح میں حرمت کا ایک سبب تو یہ ہے کہ قرض انتہاءً مبادلہ ہے اور اجل بحکم صفت کے مقابلے میں نصف قرض پانچ سو روپے مقروض کو مل رہا ہے جو کہ صفت کا عوض ہے۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ مقروض کو دین مع **صفة الاجل** دیا گیا تھا اور اب فقدانِ صفتِ اجل کی وجہ سے قرض خواہ پانچ سو میں رجوع کرتا ہے' لہٰذا جائز نہ ہوگا۔ اس طرح **فتاویٰ هنديه' الباب العاشر'** ج۳' ص ۷۲ کی عبارت سے بھی بظاہر مسئلہ زیر بحث کا عدم جواز معلوم ہوتا ہے۔ وہ عبارت اس طرح ہے:

رَجُلٌ باع علی انه بالنقد بکذا وبالنسیئة بکذا او الی شهر بکذا والی شهرین بکذا لم یجز کذا فی الخلاصة

عالمگیریہ کی مندرجہ بالا عبارت سے معاملہ زیر بحث کا جو عدم جواز معلوم ہوتا ہے وہ اس صورت میں ہے کہ مجلس میں کسی ایک صورت کی تعیین کیے بغیر بائع اور مشتری علیحدہ ہو جائیں تو یہ صورت تردّد/جہالت فی الثمن کی وجہ سے ناجائز ہوگی' لیکن اگر مجلس میں طے ہو جائے کہ نقد لے گا یا ادھار تو عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں۔ چنانچہ ابن الہمام نے فتح القدیر کتاب البیوع کے اوائل میں لکھا ہے: تحت قوله (ویجوز البیع بثمن حالٍ ومؤجل) واما البطلان فیما اذا قال بعتکه بالف حالاً وبالفین الی سنة فلجهالة الثمن (۷)

''اس معاملے کا باطل ہونا' جس میں بائع مشتری سے کہے کہ نقد میں ہزار اور سال تک دو ہزار میں یہ چیز تمہیں بیچ دی' اس لیے ہے کہ ثمن میں جہالت ہے۔''

یعنی اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ معاملہ ربا النسیئہ میں داخل ہے بلکہ اس کی وجہ تردد/جہالت فی الثمن ہے' اگر ثمن کی تعیین ہو جائے تو پھر عدمِ جواز کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیع یا ایک بیع میں دو شرطیں لگانے سے منع کرتے ہوئے فرمایا تھا:

عن ابی هریرة ؓ قال: ''نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ''(۸) اور

عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده قال قال رسول الله ﷺ: ((لَا يَحِلُّ سَلَفٌ وَبَيْعٌ، وَلَا شَرْطَانِ فِيْ بَيْعٍ، وَلَا رِبْحُ مَالَمْ يُضْمَنْ وَلَا بَيْعُ مَالَيْسَ عِنْدَكَ))(۹) قال الترمذی حدیث حسن صحیح

جبکہ ابوداؤد نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے:

((مَنْ بَاعَ بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ فَلَهٗ اَوْكَسُهُمَا اَوِ الرِّبَا)) (۱۰)

اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو مختصر کرتے ہوئے صرف یہ ذکر کیا ہے:

((لَا يَحِلُّ بَيْعُ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ وَلَا رِبْحُ مَالَمْ يُضْمَنْ)) (۱۱)

حدیث ابی ہریرہ ؓ بیعتین فی بیعة کی تفسیر میں اختلاف ہے' چنانچہ امام شافعی نے اس کے دو مفہوم بیان کیے ہیں:

(۱) بائع مشتری سے کہے: بعتك بالفین نسیئةً وبالف نقدا فایهما شئت أخذت به علی ان البیع قد لزم فی احدهما وهذا بیع فاسد وباطل لانه ابهام وتعلیق(۱۲) ''میں نے یہ چیز تمہیں دو ہزار ادھار میں اور ہزار میں نقد بیچی' ان دو صورتوں میں جو صورت تم چاہو قبول کر لو' بنا بریں کہ بیع ان میں سے ایک صورت میں لازم ہو چکی ہے۔ یہ بیع فاسد اور باطل ہے' کیونکہ ایک تو اس میں ابہام اور دوسرے تعلیق ہے۔''

(۲) دوسرا مفہوم یہ ہے: بعتك ذا العبد علی ان تبیعنی دارك بکذا ''میں نے یہ غلام اس شرط پر تمہیں بیچا

کہ تم اپنا گھر مجھے بیچو گے۔''

پہلی صورت کی حرمت کی وجہ مقدار ثمن کی جہالت کے سبب اس معاملے کا غرر پر مشتمل ہونا ہے' کیونکہ خریدار کو عقد کی تکمیل تک یہ علم نہیں ہوتا کہ میرے ذمے ثمن کی مد میں دو ہزار کی ادائیگی ہے یا ایک ہزار کی۔

دوسری صورت کی حرمت کی وجہ دوسروں کی حاجات وضروریات سے ناحق فائدہ اٹھانا ہے جو از روئے شریعت ناجائز ہے' کیونکہ بسا اوقات خریدار کو کسی شے کے خریدنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے' اس صورت میں بائع کا اس پر یہ شرط لگا دینا کہ میں یہ شے تجھے اس شرط پر فروخت کروں گا کہ تم اپنا گھر مجھے فروخت کرو' اس کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔ چنانچہ مشتری اپنی ضرورت سے مجبور ہو کر اسے اپنا گھر فروخت کرنے پر تیار تو ہو جاتا ہے لیکن گھر کے فروخت کرنے میں اس کی رضامندی شامل نہیں ہوتی اور اس طرح بیع ناجائز ہو جاتی ہے' کیونکہ بیع میں رضامندی ایک لازمی عنصر ہے۔ بخوائے آیت قرآنی:

﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾

اور ''شرطین فی بیع'' کی تفسیر میں بھی مختلف اقوال ہیں:

(۱) بائع کہے کہ میں نے یہ چیز نقد میں اتنے اور ادھار میں اتنے پر تمہیں بیچی۔

(۲) بائع مشتری پر مبیع کے نہ بیچنے یا کسی کو ہبہ نہ کرنے کی شرط لگا دے۔

(۳) میں یہ شے تمہیں اس شرط پر بیچتا ہوں کہ تم مجھے اپنی فلاں چیز اتنے کی بیچو۔

(۴) بعض علماء نے اس کی وضاحت اس طرح بھی کی ہے کہ کسی نے ایک دینار کسی کو ایک قفیز گندم ایک ماہ تک دینے کے عوض دیا' مہینہ پورا ہونے پر جب مشتری نے اس سے گندم کا مطالبہ کیا تو بائع نے کہا وہ قفیز گندم جو میرے اوپر تمہیں دینا لازم ہے وہ مجھے دو ماہ تک دو قفیز گندم کے عوض بیچ دو۔ یہ صورت بھی بیعتین فی بیعة کی ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ **بیعتین فی بیعة** اور **الشرطین فی بیع واحد** یہ دونوں دراصل ایک ہی چیز ہیں۔ علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے۔

حنفیہ کے نزدیک یہ بیع فاسد ہے' کیونکہ ابہام اور تعلیق کی وجہ سے ثمن مجہول ہے اور اس میں قرار نہیں ہے کہ اس کی ادائیگی حالاً ہے یا مؤجلاً ہے۔ اگر اس ابہام کو رفع کر کے کسی ایک صورت کی تعیین ہو جائے تو عقد صحیح ہو جائے گا[۱۳] حاصل یہ کہ **بیعتین فی بیعة** کی حرمت کی علت **عدم استقرار الثمن فی صورة بیع الشیء الواحد بثمنین** ہے۔

شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک یہ عقد باطل ہے' کیونکہ **جهالت فی الثمن** کی وجہ سے اس عقد کا تعلق بیوع الغرر سے ہو جاتا ہے' کیونکہ بائع کی طرف سے کسی ایک بیع پر جزم نہیں ہے۔ اس بیع کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کہے: **بعتك هذا او هذا** (میں نے تمہیں یہ بیچا یا یہ)۔

دوسری وجہ یہ کہ ثمن مجہول ہے لہٰذا عقد صحیح نہیں' جیسے **بیع بالرقم المجهول**۔ تیسری وجہ یہ کہ عوضین میں

سے ایک عوض معلوم اور معین نہیں' اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کہے بعتك احد منازلی ''میں نے تجھے اپنے گھروں میں سے ایک گھر بیچا''(۱۴)

امام مالک کا مسلک ابن رشد نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

اَمّا الوجه الثالث ' وهو ان يقول له : ابيعك هذا الثوب نقدًا بكذا او نسيئةً بكذا' فهذا ان كان البيع فيه واجبًا فلا خلاف فى انه لا يجوز' واما اذا لم يكن البيع لازماً فى احدهما فاجازه مالك ومنعه ابو حنيفة والشافعى' لانهما افترقا على ثمن غير معلوم' وجعله مالك من باب الخيار لانه اذا كان عنده على الخيار لم يتصور فيه ندم يوجب تحويل احد الثمنين فى الآخر' وهذا عند مالك هو المانع' فعلة امتناع هذا الوجه الثالث عند ابى حنيفة والشافعى من جهة جهل الثمن' فهو عندهما من بيوع الغرر التى نهى عنها.....(۱۵)

''تیسری صورت یہ ہے کہ میں اتنی قیمت نقد یا اتنی قیمت ادھار کے عوض یہ کپڑا تمہارے ہاتھ بیچتا ہوں۔ اگر اس صورت میں بیع لازم ٹھہرتی ہے تو اس کے ناجائز ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں اور اگر بیع لازم نہیں ہے تو امام مالک اسے جائز اور امام ابوحنیفہ اور امام شافعی ممنوع قرار دیتے ہیں' کیونکہ فریقین غیر متعین ثمن پر الگ ہوئے اور امام مالک نے اسے باب الخیار میں رکھا ہے' کیونکہ اگر اسے اختیار حاصل ہے تو اس ندامت کا تصور نہیں کیا جا سکتا جو اس قیمت کو دوسری قیمت میں تبدیل کر دے اور امام مالک کے نزدیک مانع یہی ہے۔ اس طرح اس تیسری صورت کے ممنوع ہونے کی وجہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے ہاں ثمن سے ناواقفیت ہے اور یہ جہالت فی الثمن اس بیع کو بیع غرر میں تبدیل کر دیتی ہے جو ممنوع ہے۔''

بیع مؤجّل اور ربا النّسیئہ میں فرق

بیع مؤجّل/بیع بالتقسیط اور ربا میں اگرچہ بظاہر تشابہ ہے کہ بیع مؤجل اور بیع بالتقسیط دونوں میں قیمت کا اضافہ اجل کے مقابلہ میں نظر آتا ہے لیکن درحقیقت دونوں میں کئی وجوہ سے فرق ہے۔

(۱) اللہ عزوجل نے حاجت کی بنیاد پر بیع کو حلال فرمایا ہے: ﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ﴾ اور ربا میں زیادتی محض مدت کے مقابلے میں ہونے کی وجہ سے حرام ہے' کیونکہ اجل (مدت) بمنزلہ وصف کے ہے اور اس کا معاوضہ لینا حرام ہے۔

(۲) ربا (سود) میں زیادتی بمقابلہ اجل اسی جنس سے ہوتی ہے جو مقروض کو ملا ہوتا ہے' مثلاً ایک مَن گندم دے کر مدتِ معینہ کے بعد ڈیڑھ من گندم لینا' یا ہزار درہم قرض اس شرط پر دینا کہ مدت معینہ کے بعد اس کی واپسی پندرہ سو درہم کی صورت میں ہوگی۔ جبکہ بیع مؤجل / بیع بالتقسیط میں محلِّ عقد (مبیع) سلعۃ (سامان) کی شکل میں ہوتا ہے جس کی نقد قیمت ہزار اور ادھار پندرہ سو ہوتی ہے۔ یہ معاملہ ربا نہیں ہے' کیونکہ مشتری کو سامان ملا ہے نہ کہ نقد دراہم۔ دوسرے مشتری نے قیمت پر جو اضافہ دیا ہے وہ خریدے ہوئے سامان کی جنس سے نہیں ہے۔ اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ موجود شے بمقابلہ ادھار شے کے مرغوب فیہ اور ادھار کی قیمت نقد کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔

(۳) ربا النسیئہ میں محلّ عقد (معقود علیہ) اثمان ہوتے ہیں جن کی قدر تو متعیّن ہوتی ہے لیکن وہ مقصود بالذّات نہیں بلکہ اعیان کے حصول کے وسائل اور ذرائع ہوتے ہیں۔ یہ اثمان چاہے پہلے سے معلوم ہوں' جیسے ابوبکر جصاص نے عربوں میں نزولِ قرآن کے وقت رائج ربا کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

والربا الذی کانت العرب تعرفه وتفعله انما کان قرض الدراهم والدنانیر الی اجلٍ بزیادة علی مقدار ما استقرض علی ما یتراضون (۱۶)

''وہ ربا جس سے عرب واقف تھے اور جو ان میں رائج تھا وہ درہم و دینار کا مدت معینہ تک قرض دے کر باہم رضامندی سے اس مقدار قرض پر اضافہ لینا تھا۔''

یا بائع و مشتری کے درمیان کسی عین کی خرید و فروخت کے نتیجے میں طے شدہ ہوں' جیسے بقول قتادہ:

اِنَّ ربا الجاهلیة بیع الرجل المبیع الی اجل مسمی' فاذا حَلَّ الأجل ولم یکن عند صاحبه قضاء زاده وأخر عنه

''دورِ جاہلیت کا ربا یہ تھا کہ ایک شخص کوئی چیز دوسرے کو ایک مدّت معیّن تک ادھار بیچتا تھا'' جب مدت متعین پوری ہو جاتی اور مشتری کے پاس ادھار چکانے کے لیے کچھ نہ ہوتا تو بائع مزید مہلت دے کر ثمن میں اضافہ کر لیتا تھا۔''

ان اثمان پر اضافہ بالاجل اور بغیر الاجل دونوں صورتوں میں ناجائز ہے۔ بالاجل تو اس لیے کہ نقود متعین القدر ہوتے ہیں' ان کی قیمت متعین ہوتی ہے' ان میں اضافہ نہیں ہو سکتا' لہٰذا اضافہ لامحالہ اجل کی طرف منسوب ہوگا جو ربا النسیئہ ہے اور از روئے قرآن مجید حرام ہے' کیونکہ اجل کی کوئی قیمت نہیں ہوتی (**ان الثمن لا یقابله شیء من الثمن**)۔ اور بغیر الاجل اس لیے کہ ربا الفضل ہے جو از روئے حدیث حرام ہے۔

(۴) بیع مؤجل میں کوئی شخص بلاشرکت غیرے کسی عین کا مالک ہوتا ہے' اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اعیان مقصود بالذات تو ہوتے ہیں لیکن ان کی قدر و قیمت متعین نہیں ہوتی' بلکہ اس کی قیمت کی تعیین میں مختلف عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ مختلف حالات' عوامل و اسباب کی بنیاد پر اس کی قیمت مختلف ہوتی رہتی ہے' ہر شخص اس کی قیمت کا تعین اپنی ضرورت و حالات کی بنیاد پر کرتا ہے۔ جس کی ضرورت جس قدر شدید ہوتی ہے اس کے نزدیک اس عین کی قدر و قیمت اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح مالک عین بھی اپنی ضرورت اور اس میں شدت و کمی کی بنیاد پر اپنی مملوک عین کی قدر و قیمت مقرر کر کے کسی ایک آفر کو قبول کرتا ہے۔ اس عین کی قدر و قیمت کا حقیقی پیمانہ بازاری نرخ نہیں ہوتا جس پر زیادتی لازماً اس عین کی قدر و قیمت پر اضافہ شمار کیا جائے۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس عین کی بازاری قیمت اس کی اصل قدر و قیمت ہے اور اس پر اضافہ اجل اور میعاد کے مقابلے میں ہے۔

سود خور اگر کسی کو بطور قرض ایک سال تک ہزار روپے دے دیتا ہے یا کسی کو کوئی چیز ہزار روپے کے بدلے ایک سال تک ادھار دیتا ہے تو وہ یہ سوچتا ہے کہ یہ ایک ہزار روپے مجھے ایک سال بعد ملیں گے' میں ایک سال تک انتظار کرتا رہوں گا' کیوں نہ اس ایک سال کا معاوضہ مقروض اور مشتری سے لیا جائے' اس لیے وہ مقروض اور

خریدار سے کہتا ہے کہ سال کے بعد تم مجھے ہزار کے بجائے گیارہ سو روپے دو گے' تو یہ سو روپے کا اضافہ اس تاخیر کا معاوضہ ہوگا جو کہ مال نہیں ہے' اور اگر سال بھر کے بعد ادائیگی نہ ہوئی تو اگلے سال کے لیے مزید ایک سو روپے دینا ہوگا۔ تو یہ اضافہ خود دَین کی ادائیگی میں مدت بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے' جتنی مدت گزرتی جاتی ہے اسی تناسب سے اصل دَین پر اضافہ ہوتا رہتا ہے' جبکہ زیر بحث مسئلہ بیع مؤجل میں یہ صورت نہیں' بلکہ تاجر اپنے ذہن میں سوچتا ہے کہ نقد ادائیگی کی صورت میں میں اپنی یہ چیز بازاری قیمت مثلاً سو روپے پر فروخت کر دوں' لیکن یہ شخص دو ماہ بعد ثمن کی ادائیگی کرے گا تو اس سے کہتا ہے کہ میں اپنی یہ چیز ایک سو دس روپے میں تمہیں فروخت کرتا ہوں' اگر تم دو ماہ کی میعاد پر یہ چیز خریدنا چاہتے ہو تو خرید لو اور خریدار دو ماہ کی میعاد پر وہ خرید لیتا ہے۔

اس معاملے کا ربا سے دو وجوہات سے فرق ہے:

(۱) دَین پر اضافہ نہیں بلکہ شروع ہی سے ثمن میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

(۲) مدت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس زیادتی میں اضافہ نہیں ہوتا' مثلاً اگر کسی وجہ سے خریدار دو ماہ کے بعد ادائیگی نہ کر سکا تب بھی بائع کا اس سے مطالبہ ایک سو دس روپے ہی کا ہوتا ہے ایک سو پندرہ یا ایک سو بیس کا نہیں۔

حدیث نبویؐ ((کُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ الرِّبَا)) سے بھی بیع مؤجل/بیع بالتقسیط کے ناجائز ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ بیع مؤجل پر قرض کا اطلاق غلط ہے۔

عقد مداینہ کی تعریف علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر اور علامہ ابن العربی نے اپنی فقہی تفسیر ''احکام القرآن'' میں ان الفاظ میں کی ہے:

الدَّین عبارة عن کل معاملة کان احد العوضین فیها نقداً والآخر نسیئةً فان العین عند العرب ماکان حاضرًا والدَّین ما کان غائباً (۱۷)

''دَین اس معاملے کو کہا جاتا ہے جس میں عوضین میں سے ایک عوض نقد اور دوسرا ادھار فی الذمہ ہو' کیونکہ جو چیز حاضر اور سامنے ہو عرب اس کو عین اور جو غائب ہو اس کو دَین کہتے ہیں۔''

اور ابوبکر جصاص نے لکھا ہے:

ومما یدل علی ان القرض لم یدخل فیه ان قوله تعالی "اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی" قد اقتضی عقد المداینة ولیس القرض بعقد المداینة ..... فوجب ان یکون القرض خارجًا منه (۱۸)

''اور ان دلائل میں سے کہ قرض اس میں داخل نہیں ہے ایک دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد 'اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ' ہے' کیونکہ اس ارشاد کا تقاضا عقد مداینہ ہے اور قرض عقد مداینہ نہیں ..... پس واجب ہے کہ قرض اس سے خارج ہو۔''

قرض کی تعریف کے بارے میں علامہ ظفر احمد عثمانی نے حاشیہ ہدایہ سے صاحبِ کفایہ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

اعلم ان القرض مال یقطعه من امواله فیعطیه' وما ثبت علیه دینا فلیس بقرض' والدَّین

یشمل کل ما وجب فی ذمته بعقد او استهلاك، وما صار فی ذمته دینا باستقراض فهو اعم من القرض

''جان لو کہ قرض وہ مال ہوتا ہے جو اپنے مال سے جدا کر کے کوئی کسی کو دیتا ہے اور جو کسی کے ذمے بطور دَین ثابت ہو وہ قرض نہیں۔ اور دَین شامل ہوتا ہے ہر اس شے کو جو کسی عقد یا استہلاک سے ذمہ پر واجب ہو جاتا ہے یا وہ جو قرض لینے سے ذمے پر ثابت ہو جائے، پس دین اعم ہے قرض سے۔''

اسی طرح انہوں نے قرض کی تعریف میں صاحب مغرب کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

واما قول صاحب المغرب، القرض مال یقطعه الرجل من امواله فیعطیه عینا، فاما الحق الذی یثبت له دینا فلیس بقرض ..... الخ فلا دلالة فیه علی ان الدین لا یطلق علی القرض بل معناه ان القرض لا یطلق علی کل دَین(۱۹)

''صاحب مغرب کے اس قول ''قرض وہ مال ہوتا ہے جسے کوئی شخص اپنے اموال سے جدا کر کے کسی کو دیتا ہے اور جو حق اس کے لیے بطور دین ثابت ہوتا ہے تو وہ قرض نہیں ہے'' پس اس میں اس پر کوئی دلالت نہیں کہ دین کا اطلاق قرض پر نہیں ہوتا بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہر دین کو قرض نہیں کہا جاتا۔''

ہمارے زیر بحث مسئلہ بیع مؤجل/بیع بالتقسیط میں قرض سے فائدہ اٹھانے کا کوئی شائبہ ہی نہیں ہے، کیونکہ انعقادِ عقد سے قبل قیمت طے کرتے وقت قرض تو کیا دَین کا تحقق بھی نہیں ہے۔ جب قرض کا تحقق ہی نہیں تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا سوال؟

مزید ربا النسیئہ میں اجل کو باقاعدہ مستقل مبیع کی حیثیت سے اعتبار کیا جاتا ہے، چنانچہ قرض خواہ مقررہ مدت کے خاتمہ پر مقروض کے پاس جا کر کہتا ہے کہ میری مقررہ رقم جو تمہارے ذمہ ہے وہ ادا کرو ورنہ اتنی مدّت مزید کے بعد مقررہ رقم پر اتنا اضافہ دو گے..... جبکہ معاملہ زیر بحث میں (یعنی بیع مؤجّل/بیع بالتقسیط میں) مفروضہ زیادتی معاوضہ کی حیثیت سے نہیں ہوتی نہ مقررہ میعاد کی کوئی قیمت مقرر کی جاتی ہے اور نہ عاقدین اس کو مبیع کا جزء تسلیم کرتے ہیں تاکہ کسی وقت مقررہ قیمت، مبیع اور اجل پر تقسیم ہو سکے۔ فقہاء اس زیادتی کے لیے ''بعوض الاجل'' کی جگہ ''لاجل الاجل'' کی علت ذکر کرتے ہیں، چنانچہ صاحبِ ہدایہ ''یزاد فی الثمن لاجل الاجل'' اور ابن عابدین و ابن نجیم ''یزاد فی الثمن لاجله'' کی تعبیر اختیار کرتے ہیں۔ گویا ربا النسیئہ میں زیادتی ''بعوض الاجل'' اور ادھار بیع کے معاملہ میں ''لاجل الاجل'' ہے۔ واللہ اعلم!

حواشی

(۱) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب شراء النبی ﷺ بالنسیئة۔ وصحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب الرهن وجوازه فی الحضر کالسفر۔

(۲) نیل الاوطار، محمد بن علی بن محمد الشوکانی، ج۵، ص ۲۴۹ و ۲۵۰، باب بیعتین فی بیعة۔

(۳) سنن الترمذی، کتاب البیوع، باب ما جاء فی النهی عن بیعتین فی بیعة، باب۱۸۔ح:۱۲۳۱۔

(۴) الشرح الصغیر علی اقرب المسالك الی مذهب الامام مالك، ابو البرکات احمد بن محمد الدردیر، ج۳،

ص ٩٣' البيوع الفاسدة۔ والمغنی علی مختصر الحزقی' احمد بن محمد القدامه' ج٤' ص ١٦٨۔ والدسوقی علی الشرح الکبیر' ج٣' ص ٥٨۔ ومغنی المحتاج' للشربینی' ج٢' ص ٣١۔ والمبسوط للسرخسی ج١٣'ص٨۔

(٥) کتاب الحجة علی اهل المدینة' ج٢' ص ٢٩٥۔ (٦) المبسوط' للسرخسی' ج١٣' ص ٨۔

(٧) فتح القدیر' ج٥' ص ٨٤۔

(٨) سنن الترمذی' کتاب البیوع عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی النهی عن بیعتین فی بیعة۔

(٩) سنن الترمذی' کتاب البیوع عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی کراهیة ما لیس عندك۔

(١٠) سنن ابی داوٗد' کتاب الاجارة' باب فیمن باع بیعتین فی بیعة۔

(١١) سنن ابن ماجه' ابواب التجارات' باب النهی عن بیع مالیس عندك وعن ربح مالم یضمن۔

(١٢) نیل الاوطار' ج٥' ص ٢٤٩۔

(١٣) بدائع الصنائع' ج٥' ص ١٥٨۔ وردّ المختار' ج٤' ص ٣٠۔

(١٤) المهذب' ج١' ص ٢٦٧۔ ومغنی المحتاج' ج٢' ص ٣١۔ والمغنی' ج٤' ص ١٦٨۔

(١٥) بدایة المجتهد' ج٢' ص ١١٥۔

(١٦) احکام القرآن' دار الفکر' بیروت' باب الربا' ج١' ص ٦٣٥۔

(١٧) تفسیر القرطبی' ج٢' ص ٢٤٣' تفسیر آیة الدَّین۔ واحکام القرآن لابن لعربی سورة البقرة تفسیر آیة ﴿اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾۔

(١٨) احکام القرآن ج١' ص ٦٥٩۔ دار الفکر' بیروت۔ (١٩) اعلاء السنن' ج٤' ص ٥٢٤۔

بقیہ: ماں اور بیٹے کی محبت نفسیاتی ہے؟

تین مرتبہ سوال کے جواب میں ماں کو حق دار قرار دیا اور چوتھی مرتبہ کے جواب میں باپ کو۔ اسی تناسب سے بیٹا ماں کا احترام زیادہ کرتا ہے۔

بہرحال ان رشتہ داروں کے درمیان محبت' شفقت اور رحم کی وجوہات وہ ہرگز نہیں جن کی طرف فرائڈ اور اس کے ہم نوا اشارہ کرتے ہیں۔ اگر اس میں حقیقت ہوتی تو ان کے درمیان اس قسم کے سکینڈل بھی اتنے ہی زیادہ سامنے آنے چاہئیں' حالانکہ ایسا نہیں' بلکہ جن ممالک میں آزادی زیادہ ہے وہاں بھی اس طرح کے کیسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لیے کہ ان کے تعلق کے محرکات وہ نہیں جو نفسیات والے بتاتے ہیں۔

کیا سارے لوگوں کی نفسیات ایک طرح کی ہے؟

مذکورہ بالا رشتہ کے حوالہ سے سارے لوگوں کی نفسیات وہی ہیں جن کی طرف مذکورہ بالا سطور میں اشارہ ہوا ہے۔ لیکن جن لوگوں کی فطرت مسخ ہو چکی ہے ان کی نفسیات شاید بدل چکی ہو۔ جیسے دنیا میں خاص طور پر مغرب میں ایسے لوگ موجود ہیں جو جنسی تسکین کے لیے جنس مخالف سے زیادہ دلچسپی اپنے ہم جنس میں لیتے ہیں یا کچھ خواتین اپنے نسوانی حسن کی حفاظت کی خاطر اولاد پیدا کرنے سے گریز کرتی ہیں' یا دیگر فطرت سے متصادم سوچ رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی نفسیات عام اور سلیم الفطرت لوگوں سے مختلف ہو سکتی ہے۔ ○○

تکبّر:
ایک تجزیاتی مطالعہ

حافظ محمد زبیر

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کے لیے شریعتِ اسلامیہ اور انبیاء و رُسل کا سلسلہ جاری فرمایا ہے۔ انسانی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ باطن کی نسبت ظاہر پر توجہ زیادہ دیتی ہے اور باطن کی اصلاح کی بجائے ظاہر شریعت پر عمل ہی کو کُل دین سمجھ لیتی ہے۔ سابقہ مسلمان اقوام مثلاً یہود پر بھی ایک زمانہ ایسا آیا کہ وہ موسوی شریعت کے ظاہر میں اس قدر الجھے کہ اپنی باطنی اصلاح سے کُلّی طور پر غافل ہو گئے۔ اس زمانہ میں ان میں تورات کے بڑے بڑے فقہاء اور علماء تو موجود تھے اور ظاہر شریعت پر عمل بھی خوب ہو رہا تھا' لیکن منکسر المزاجی' تواضع' انکساری' نرم دلی' خدا خوفی' للّٰہیت' خشیت' تقویٰ اور تقرب اِلی اللہ جیسے اوصافِ حسنہ مفقود تھے' تو اللہ تعالیٰ نے ان کی باطنی اصلاح اور تزکیہ کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاصر انجیل میں موجود خطبات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے علمائے یہود کو اپنے باطن کی اصلاح اور تزکیہ نہ کرنے کی وجہ سے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔

خیر القرون کے بعد اُمتِ مسلمہ کی اکثریت میں بھی باطن کی اصلاح یا تزکیۂ نفس کی نسبت ظاہر شریعت یعنی فقہی مسائل اور ان پر عمل کی طرف توجہ زیادہ رہی ہے' جس کی وجہ سے دین کا یہ اہم گوشہ نظر انداز ہوتا رہا ہے۔ کچھ طبقات نے اگر ہر دور میں اصلاحِ باطن کی طرف 'تصوّف' کے نام سے توجہ دی بھی تو اس میں اصلاح کے شرعی منہج اور طریقۂ کار کو نظر انداز کیا گیا اور اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات کو اصلاحِ باطن اور تزکیہ کے نبوی طریق کار پر ترجیح دی گئی۔ اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس کا ایک اہم موضوع رذائل سے اپنے نفس اور باطن کو پاک کرنا ہے۔ رذائلِ انسانیہ میں سے ایک اہم تر وصف تکبر ہے۔ تکبر سے ملتے جلتے کئی ایک رذائل کی کتاب و سنت میں نشاندہی کی گئی ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) کِبر (۲) عُجب (۳) حُبِّ جاہ (۴) حُبِّ تفوق (۵) رِیا

تکبّر

تکبّر کا معنی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسرے کو حقیر جاننا ہے۔ کتاب و سنت میں تکبر کرنے والے کے لیے 'متکبر' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ متکبّرین کے بارے میں نصوص میں بہت شدید وعید آئی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ)) (۱)

''وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی اپنی بڑائی ہو۔''

تکبر کے بارے میں اس مضمون میں ہم نے تکبر کی حرمت اور شناعت پر نصوص کی کثرت نقل کرنے کی بجائے صالحین اور اہلِ علم کے اقوال کی روشنی میں اس باطنی مرض کا ایک تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس مرض کی تشخیص اور پہچان عام ہو سکے۔

تکبّر کی اقسام

اہلِ علم نے تکبّر کی تین بڑی اقسام بیان کی ہیں' جو درج ذیل ہیں:

(۱) اللہ پر تکبر کرنا' یعنی اللہ کے مقابلے میں اکڑنا' جیسا کہ فرعون نے اس تکبر کا اظہار کیا تھا اور ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ کا دعویٰ کیا تھا۔ تکبر کی یہ قسم دہریت کا لازمہ ہے۔ دہریہ یعنی اللہ کا منکر تکبر کی اس قسم میں لازماً مبتلا ہوتا ہے۔ عموماً دہریوں کی زبان سے یہ الفاظ سننے میں آتے ہیں کہ ہم نے اہلِ مذہب کے خدا کو اس دنیا سے نکال دیا ہے۔ یہ تکبر کی بدترین صورت ہے۔ جو مسلمان یا آسمانی مذاہب کے قائلین اللہ کے وجود کے بارے میں مشکوک ہو جاتے ہیں یا کسی وہم کا شکار ہو جاتے ہیں' وہ بھی اس تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ایسے پریشان خیالوں کی زبان پر آپ اکثر یہ جملے نوٹ کریں گے کہ پتا نہیں خدا ہے بھی یا نہیں؟ اگلی دنیا میں جزا و سزا ہے بھی یا نہیں؟ ہم نہ تو خدا کا اقرار کرتے ہیں اور نہ ہی انکار' وغیر ذٰلک۔

(۲) اللہ کے رسول ﷺ پر تکبر کرنا' یعنی حق کے معاملہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت نہ کرنا اور اکڑ جانا۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک صحابی نے آپ ﷺ سے سوال کیا کہ کیا اچھے کپڑے یا نیا جوتا پہننا بھی تکبر میں داخل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے''۔ اور جہاں تک تکبر کا معاملہ ہے تو وہ یہ ہے:

((اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ)) (۲)

''تکبر تو حق بات کو جھٹلا دینا ہے اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔''

تکبر کی اس قسم میں اعتقادی منافقین اور منکرینِ حدیث مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسے حضرات کی زبانوں سے ایسے جملے بکثرت سننے کو ملیں گے کہ محمد ﷺ بھی تو ہمارے جیسے انسان ہیں تو ان کی اتباع و اطاعت کیوں؟ یا ہم بھی اللہ کے کلام کو ایسے ہی سمجھ سکتے ہیں جیسا کہ محمد ﷺ نے سمجھا ہے' یا محمد ﷺ کی قرآنی تفسیر و تشریحات تو عرب کے غیر متمدن معاشرے کے لیے تھیں نہ کہ ہماری آج کی متمدن اور مہذّب دنیا کے لیے' یا محمد ﷺ کو قرآن سمجھنے کا جتنا حق حاصل تھا اتنا ہمیں بھی حاصل ہے' وغیر ذٰلک۔

(۳) اللہ کے بندوں پر تکبر کرنا' یعنی کسی بھی وصف کے اعتبار سے دوسرے انسانوں کی نسبت اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور انہیں حقیر جاننا۔ صحیح مسلم کی مذکورہ بالا روایت میں 'غمط الناس' کا معنی بعض اہلِ علم نے یہ بیان

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الإیمان' باب تحریم الکبر و بیانه۔ (۲) ایضاً۔

کیا ہے کہ اللہ کی دی ہوئی کسی نعمت میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسروں کو اس نعمت میں حقیر جاننا غمط الناس ہے' جسے آپ ﷺ نے تکبر کہا ہے۔ انسانوں میں تکبر کی سب سے عام قسم یہی ہے۔

اللہ کے بندوں پر تکبّر کی صورتیں

اسلامی معاشروں میں تکبّر کی اس قسم کی بے شمار صورتیں پائی جاتی ہیں جن میں چند ایک کی ہم نشاندہی کر رہے ہیں:

(۱) مال کے ذریعے تکبر کرنا' جو بادشاہوں' تاجروں اور مالداروں میں ہوتا ہے۔ اس صورت میں ایک مالدار شخص مال کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ جو مالدار بھی غریب کو حقیر جانے' یعنی اس کے پاس بیٹھنے یا اس کے ساتھ کھانے یا اس کے ساتھ چلنے یا اس سے گفتگو کرنے یا اس کے گھر جانے یا اس کے محلے میں جانے یا اس کے ساتھ دوستی کرنے میں ہچکچاہٹ اور حجاب محسوس کرے تو بلاشبہ وہ اس تکبّر میں مبتلا ہے۔ عموماً مالدار دین دار گھرانوں میں بھی یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ وہ اس تکبّر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک دینی ادارے میں حفظ کی کلاس سے ایک مالدار دینی رجحان رکھنے والے خاندان نے اپنے بچے اس لیے اٹھا لیے کہ اس ادارے میں ان کے ملازمین کے بچے بھی ساتھ ہی حفظ کر رہے تھے۔ عام طور پر اس کا بہانہ یہ بنایا جاتا ہے کہ غرباء کے بچوں میں تہذیب نہیں ہوتی' حالانکہ امراء کے بچے جس قدر مہذّب ہوتے ہیں' اس کا جائزہ انگلش میڈیم سکول کے بچوں کی چال چلن کی رپورٹس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اصل میں یہ تکبر ہے جس کی وجہ سے امراء اپنے بچوں کو اپنے ملازمین یا غرباء کے بچوں کے ساتھ پڑھانے میں حجاب محسوس کرتے ہیں' ورنہ بچے تو سبھی فطرتِ سلیمہ پر ہوتے ہیں' جسے دینی ماحول مل جائے اس کی تربیت ہو جاتی ہے اور جسے نہ ملے وہ چاہے غریب کا بچہ ہو یا امیر کا' بگڑ جاتا ہے۔

(۲) جمال کے ذریعے تکبر کرنا' جیسا کہ عموماً عورتوں میں ہوتا ہے۔ جب کوئی خاتون اللہ کی طرف سے عطا کیے گئے حسن پر اترائے اور دوسری خواتین کو اپنے سے کم تر سمجھے تو وہ تکبّر کی اس قسم میں بلاشبہ مبتلا ہو چکی ہے۔ اس صورت میں حسین خاتون دوسری خواتین کے خدوخال یا رنگت یا پہننے اوڑھنے کے سلیقہ پر منفی تبصرے کرتی نظر آتی ہے کہ فلاں کو تو پہننے کا ڈھنگ ہی نہیں ہے یا فلاں اپنی شکل وصورت میں بہت ہی سادی ہے یا فلاں کے چہرے پر تو مسکینی ہی چھائی رہتی ہے یا فلاں سٹائلش نہیں ہے۔ ایسے تمام تبصروں سے اگر تو حسین عورت کا مقصود اپنے آپ کو دوسری خواتین کے بالمقابل برتر سمجھنا یا ثابت کرنا ہو تو یہ تکبر ہے اور اگر اس کے دل میں ان تبصروں کے وقت اپنے حسن کی بڑائی موجود نہ ہو تو یہ غیبت ہے جو تکبر ہی کی طرح حرام ہے' اگرچہ حرمت میں اس کا گناہ تکبر سے کم ہے۔

(۳) اپنے پیروکاروں کی کثرت کے ذریعے تکبر کرنا' جیسا کہ علماء یا صوفیاء یا گدی نشینوں یا خطباء یا واعظین یا مذہبی وسیاسی جماعتوں یا انقلابی تحریکوں کے قائدین میں ہوتا ہے۔ تکبر کی اس صورت میں ایک شخص اپنے متبعین یا متاثرین کی کثرت کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ مثلاً

جب کوئی بڑا خطیب یا مشہور واعظ دوسرے خطباء وواعظین پر یہ تبصرہ کرے کہ انہیں تو منبر پر کھڑا ہونا ہی نہیں آتا یا انہیں تو پتا ہی نہیں تقریر کیسے کرتے ہیں؟ یا فلاں خطیب تو بس جمعہ ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں' وغیرذٰلک' تو یہ خطیب اور واعظ بھی بلاشبہ تکبر کے مرض میں مبتلا ہو چکا ہے۔ بعض اوقات متبعین اور متاثرین بھی اس تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں' مثلاً کسی جماعت یا تحریک سے وابستہ کارکنان اپنی جماعت یا تحریک کے ممبران کی کثرت پر اتراتے نظر آتے ہیں یا علماء' شیوخ' اساتذہ' صوفیاء اور مربیین کے پیروکار اپنے عالم' پیر' شیخ' مربی اور استاذ کو دوسرے علماء' صوفیاء' شیوخ' مربیین اور اساتذہ کے مقابلے میں آسمان پر چڑھانے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو یہ حضرات اپنے شیخ' استاذ' پیر یا مربی کو دوسروں سے بالاتر قرار دیتے ہوئے دراصل یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں کہ جب ہمارے شیخ اور استاذ تمہارے شیخ اور استاذ سے بہتر ہیں تو ہم ان شیوخ واساتذہ کے شاگرد دوسرے شیوخ واساتذہ کے شاگردوں سے بہتر ہیں۔

(۴) اپنے علم پر تکبر کرنا' جیسا کہ بعض علماء میں یہ مرض پایا جاتا ہے۔ اس صورت میں ایک عالمِ دین اپنے علاوہ علماء کو اپنے سے حقیر سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو بڑا جانتا ہے۔ بعض شیوخ الحدیث' مفتیان کرام' کبار علماء اور محققین کو آپ دیکھیں گے کہ سائلین کے ساتھ بیٹھنا اپنے وقار کے منافی سمجھتے ہیں' یا طالبانِ دین اور نوجوان علماء کے ساتھ علمی تبادلۂ خیال میں عار محسوس کرتے ہیں' یا کسی بدو مخلص سائل کی رہنمائی کو اپنے وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں' یا دوسرے علماء کے دلائل پر اس لیے توجہ نہیں دیتے یا ان کی تحقیقات سے استفادہ نہیں کرتے کہ وہ علم میں ان کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ علمی تکبر کے اس دریا میں فقہی مسالک و مذاہب کے متبعین کی اکثریت سرتاپا غرق ہے۔ ایک مسلک کے نمائندہ علماء دوسرے مسالک و مذاہب کے علماء کو حقیر جانتے ہیں اور انتہائی اخلاص سے یہ تکبر اپنے دل میں پالتے رہتے ہیں کہ علمی اعتبار سے اس جہاں میں ہمارا کوئی ثانی نہیں ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ اگر کسی بڑے عالمِ دین' شیخ الحدیث یا مفتی صاحب کو مذہبی جلسہ وتقریب کے دوران سٹیج پر جگہ نہ ملے اور وہ عوام الناس کے ساتھ نیچے فرش پر بیٹھنے میں حجاب محسوس کریں تو یہ عالمِ دین' شیخ الحدیث اور مفتی صاحب علمی تکبر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی عالم دین یا شیخ الحدیث یا مفتی صاحب کو مخاطب کرتے وقت القابات کا لحاظ نہ کیا جائے اور براہِ راست ان کا نام لے لیا جائے اور وہ اس کو برا جانیں تو بلاشبہ یہ بھی تکبر ہی کی ایک قسم ہے۔

اس بحث سے مقصودِ کلام یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں عام طور پر تکبر کی یہ صورتیں نہیں ہوتی ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کو اپنے ہر ہر فعل اور عمل کا محاسبہ اور تجزیہ کرتے رہنا چاہیے کہ میرا یہ عمل کہیں میری باطنی نشوونما یا تزکیہ میں رکاوٹ تو نہیں بن رہا ہے۔

تکبّر کے درجات

بعض اہلِ علم نے تکبر کے تین درجات بیان کیے ہیں:

(۱) دل میں اپنی بڑائی ہو اور ظاہر میں تواضع وانکساری۔ تکبر کا یہ درجہ انتہائی خطرناک ہے اور اس کا تجزیہ کرنا

بھی انسان کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس درجہ میں تکبر صرف دل تک محدود رہتا ہے اور انسان کے عمل یا قول میں داخل نہیں ہوتا۔

(۲) تکبّر کا دوسرا درجہ دل کے بعد اپنے افعال و اعمال میں تکبر کا اظہار کرنا ہے۔ مثلاً کوئی شخص مجالس، محافل، دوستوں، خاندان اور معاشرے میں اپنے عمل و فعل کے ذریعے اپنی بڑائی چاہے، جیسا کہ ہم نے سابقہ صفحات میں اس کی کئی ایک مثالیں بیان کی ہیں۔ حدیث میں تہبند یا شلوار کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے کو عملی تکبر میں شامل کیا گیا ہے۔ گردن میں چادر ڈال کر دونوں کندھوں سے نیچے لٹکانا بھی پنجاب کے چوہدریوں میں عملی تکبر کی ایک صورت ہے۔ بعض اوقات جبّوں اور قبّوں کے ذریعے بھی عملاً اپنی بڑائی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

(۳) تکبّر کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے دل اور عمل سے بڑھ کر اپنی زبان سے فخر کا اظہار کرے، مثلاً اپنے تزکیۂ نفس یا نیک ہونے کے دعوے کرے۔ بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ باتوں باتوں میں ہر کسی کو اپنے تہجّد گزار ہونے یا نیک ہونے یا بڑا عالمِ دین ہونے یا تعلیمی اسناد کی تاریخ سنانے یا عظیم محقق ہونے یا فل پروفیسر ہونے یا دین کا عظیم خادم بتلانے کے لیے بے چین و مضطرب ہوتے ہیں۔ بلاشبہ اس قسم کے اقوال میں تکبر قولی کی واضح صورت جھلکتی نظر آتی ہے۔ اگر کسی شخص میں یہ عادت ہو تو اسے اپنی باطنی اصلاح کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

تکبّر کے اسباب

تکبّر کیوں پیدا ہوتا ہے؟ یا اس کے اسباب کیا ہیں؟ تکبر کے اسباب میں سے اہلِ علم نے حسد، بغض، کینہ، عجب اور ریا کا تذکرہ کیا ہے۔ جب کوئی شخص مال، علم، حسن و جمال یا مقام و مرتبے میں دوسرے سے حسد محسوس کرتا ہے تو عموماً اس پر تکبر کے ذریعے بڑائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی طرح جب کوئی شخص کسی دوسرے سے اپنے دل میں بغض اور کینہ رکھتا ہے تو یہ بھی اس کے تکبر کا سبب بن جاتے ہیں۔ اپنے نفس کے عشق میں مبتلا ہونا یعنی خود پسندی اور عجب بھی تکبر کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے۔ اسی طرح ریا کاری بھی تکبر کے اسباب میں داخل ہے۔

تکبّر کا علاج

اہلِ علم نے تکبر کے دو قسم کے علاج تجویز کیے ہیں جو ذیل میں بیان کیے جا رہے ہیں:

علمی علاج: تکبر کا علمی علاج یوں کیا جا سکتا ہے کہ انسان جب اللہ کی دی ہوئی کسی نعمت یا صفت یا کمال پر اپنے نفس میں بڑائی محسوس کرے تو یہ سوچ بار بار پیدا کرے:

(۱) میرے اندر کا یہ کمال حق سبحانہ وتعالیٰ کا پیدا کردہ ہے، یعنی عطائی ہے اور اس کے حصول میں میرا کوئی ذاتی عمل دخل نہیں ہے۔

(۲) میں کسی ذاتی اہلیت کی بنا پر اس نعمت خداوندی کا مستحق نہیں تھا، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ کمال عطا فرما کر

مجھے اپنی رحمت سے نوازا ہے۔

(۳) اس کمال کے اللہ کی طرف سے عطا کیے جانے کے بعد اس کی بقا میرے اختیار اور بس میں نہیں ہے اور کسی بھی وقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسے سلب کر سکتے ہیں۔

(۴) اگرچہ دوسرے شخص میں یہ کمال فی الحال نہیں ہے لیکن ممکن ہے مستقبل قریب یا بعید میں اسے یہ کمال مجھ سے بھی زائد درجہ میں حاصل ہو جائے۔

(۵) اس کا بھی غالب امکان ہے کہ دوسرے شخص میں کچھ ایسے کمالات ہوں جو میری نظر سے مخفی ہوں اور ان کی بنا پر اس کا رتبہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں مجھ سے زائد ہو۔

عملی علاج: تکبر کا عملی اور بہترین علاج یہ ہے کہ انسان جس کو اپنے نفس سے چھوٹا سمجھے' اس کے ساتھ بیٹھے' کھائے' پیئے' گفتگو کرے' دوستی کرے' اس کا احترام کرے' اس کے بارے میں تحسین کے کلمات کہے اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئے۔ مثلاً ایک امیر اپنے تکبر کو غرباء میں بیٹھ کر اور ایک عالمِ دین اپنے تکبر کو طلبہ میں بیٹھ کر دور کر سکتا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ اہل علم نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ شریعت میں ازالہ نہیں بلکہ امالہ ہے' یعنی معصیت کا مادہ ہی انسان سے ختم ہو جائے تو یہ شریعت کا مطالبہ نہیں ہے' بلکہ شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان معصیت کے تقاضوں پر عمل نہ کرے اور ان کو کنٹرول کرے۔ پس تکبر کا مادہ ختم کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ تکبر کے تقاضوں پر عمل نہ کرنا اور اس بیماری کا علاج کرنا مقصودِ شرع ہے۔

تکبّر سے متعلقہ بعض دوسری اصطلاحات

مضمون کے شروع میں ہم نے تکبر سے متعلق بعض دوسری اصطلاحات کا تذکرہ کیا تھا' ان کا ایک مختصر تعارف ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں تاکہ تکبر کے علاوہ ان باطنی بیماریوں کی پہچان بھی سالکین کے لیے آسان ہو۔

عُجب: اس سے مراد اپنے کو بڑا سمجھنا ہے۔ اس میں دوسری قید شامل نہیں ہے یعنی دوسرے کو حقیر سمجھنا۔ اسے خود بینی یا خود پسندی کا نام بھی دیا جاتا ہے' یعنی اپنے نفس کو ہی دیکھتے رہنا یا اپنے نفس ہی کے عشق میں مبتلا ہو جانا۔ قرآن میں خود پسند کے لیے 'مختال' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

حُبِّ جاہ: اپنے آپ کو دل ہی دل میں بڑا سمجھنا اور اس کی کوشش بھی کرنا کہ دوسرے بھی مجھے بڑا سمجھیں۔

حُبِّ تفوّق: دوسروں پر غالب آنے کی شدید خواہش رکھنا اور اس پر عمل کرنا حب تفوق کہلاتا ہے۔ مشہور فلسفی 'ایڈلر' نے 'urge to dominate' کے نام سے اس بارے میں ایک پورا فلسفہ متعارف کروایا ہے۔

ریا: کسی دینی عمل کو لوگوں کی نظر میں بڑا بننے کا ذریعہ بنانا ریا کاری کہلاتا ہے۔

تکبر سے متعلق ان اصطلاحات میں ہر ایک مستقل مضمون کی متقاضی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ہم سب کو اس موذی مرض سے بچنے اور لگ جانے کی صورت میں اس کا علاج کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

ماں اور بیٹے کی محبت نفسیاتی ہے؟

مولانا عصمت اللہ ☆

فرائڈ اور دیگر ماہرینِ نفسیات کی اکثریت کہتی ہے کہ والدین کی محبت اولاد کے ساتھ یکساں نہیں ہے' اسی طرح اولاد کی طرف سے بھی فرق موجود ہے۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک جنس مخالف سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور اس کا محرّک جنس ہوتا ہے۔ ان افکار سے متاثر لوگوں کی طرف سے چونکہ اس کا اظہار عام مجالس میں کئی دفعہ علم میں آیا ہے اس لیے دل کی عدمِ رغبت کے باوجود اس پر اپنے خیال کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے' کیونکہ یہ نظریہ لوگوں میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ سلیم الفطرت انسان سے یہ توقع اگرچہ نہ ہونے کے برابر ہے کہ وہ ان باتوں کو قبول کر لے گا' لیکن جب تک مذکورہ نظریہ کی غلطی دلائل سے ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک سکون واطمینان نہیں ملتا۔ ہوسکتا ہے کہ مندرجہ ذیل گزارشات اس نظریہ کو رد کرنے میں مفید ثابت ہو جائیں۔ موضوع کو شروع کرنے سے پہلے قرآن کریم کی آیت اور حضور ﷺ کی حدیث کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے' کیونکہ اس سے اصل موضوع سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ قرآن کا حکم گواہی کے سلسلے میں یہ ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے۔ قرآن کے اس حکم میں اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم حکمت کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ پروردگار نے جس چیز کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اسی سے مناسبت رکھنے والی صلاحیتیں اس میں ودیعت کی ہیں۔ خاتون کو اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اس کا تعلق ہوش سے کم اور جوش سے زیادہ ہے' یعنی اس کے جذبات میں شدت ہے۔ خاص طور پر محبت اور رحم کا جذبہ عورت میں مرد کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ اس لیے ہے کہ عورت اپنی ذمہ داری اس کے بغیر احسن طریقہ سے ادا نہیں کر سکتی۔

عورت کی تخلیق کا مقصد

عورت کی تخلیق کا بنیادی مقصد نسلِ انسانی کی افزائش ہے۔ چنانچہ اولاد کی خواہش اس میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس کی گہرائی اور اس سے اس کی مغلوبیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ مرد کے مقابلے میں انتہائی کمزور ہونے کے باوجود' اپنے خاندان سے محبت اور اس میں امن وسکون سے رہنے اور ہر ضرورت فراہم ہونے کے باوجود' ایک اجنبی اور انجان خاندان میں جانے کے لیے نہ صرف خوشی سے تیار ہوتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ سے اپنی جلد شادی کی دعائیں بھی مانگتی ہے۔ بہت ساری عورتیں جو دولت مند ہیں' خدمت کے لیے بہت نوکر چاکر ان کے پاس ہوتے ہیں' پھر بھی شادی کر لیتی ہیں۔ اس کی اس خواہش کی شدت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے

☆ اسسٹنٹ پروفیسر اسلامیات' گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ

کہ ایک بچہ کو پیٹ میں لیے گھومنے اور اسے جننے اور پالنے میں کتنی غیر معمولی تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں' لیکن ان سب کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک چیز کے ساتھ اتنا سخت لگاؤ اس سے چاہت کے جذبہ کی شدّت کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

نسلِ انسانی کی افزائش کے سلسلے میں سب سے پہلے عورت کو ایک شوہر کی ضرورت ہے' اور اس ضرورت کا احساس بھی بہت شدید ہے' جس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ اپنے شوہر کو خوش رکھنے کے لیے عورت اپنی آزادی قربان کر لیتی ہے اور اس قربانی کے لیے پوری زندگی میں تیار رہتی ہے۔ اس قربانی کو شوہر کی محبت نے ممکن بنایا اور اس محبت کو بیوی کے دل میں اللہ نے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ﴾ (الروم:۲۱)

''اور اُس نے تمہارے (میاں بیوی کے) درمیان محبت اور رحمت پیدا کی ہے۔''

مطلب یہ کہ جوانی کے زمانے میں محبت کرتے ہیں' بڑھاپے میں ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں۔ غزوۂ اُحد کی طرف سے لوگ آ رہے تھے' ایک عورت معلومات کے لیے سامنے آئی تو ایک آدمی نے اس سے کہا آپ کا بھائی شہید ہو گیا' وہ خاموش رہی۔ دوسرے گروہ میں ایک آدمی نے ان سے کہا آپ کے والد شہید ہو گئے۔ اس پر بھی وہ خاموش رہی۔ تیسرے گروہ میں سے ایک نے کہا آپ کا بیٹا شہید ہو گیا' پھر بھی خاموش رہی۔ چوتھے آدمی نے جب ان سے کہا کہ آپ کا شوہر بھی شہید ہو گیا ہے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب حضور ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''عورت کو سب سے زیادہ محبت اپنے شوہر سے ہوتی ہے''۔ اس کے بعد نسلی افزائش کا تعلق جس چیز سے ہے وہ ہے اولاد۔ اس سے عورت کی محبت تو سب کو معلوم ہے اور مثالیں بھی اسی سے دی جاتی ہیں۔ حضور ﷺ نے بھی اسی طرح ایک مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ماں سے ستر گنا زیادہ مہربان اور رحیم ہے۔ یاد رہے کہ عورت شوہر سے محبت کرتی ہے' اولاد پر رحم اور شفقت۔

اصل بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا مقصد یعنی نسلی افزائش ایک ایسی ذمہ داری ہے جس کی تکمیل عقل کے ذریعہ ناممکن ہے' یہ صرف اس وقت حاصل کی جا سکتی ہے جب مطلوبہ جذبات عقل پر غالب رہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ناممکن ہے کہ یہ جذبات صرف مقاصد تک محدود ہوں' بلکہ اپنے اثرات دوسرے مقامات پر بھی دکھاتے ہیں اور وہاں بھی یہ جذبات عقل پر غالب ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دکھ کے موقع پر غم کے اظہار اور سکھ کے موقع پر خوشی کے اظہار میں مرد کے مقابلے میں عورت کئی گنا آگے ہوتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے اسی بنا پر عورت کو ناقص العقل قرار دیا ہے' یعنی اس کی محبت' شفقت اور رحمت کے جذبات اس کی عقل پر غالب آ جاتے ہیں' اور اسی فرطِ جذبات کی وجہ سے ممکن ہے گواہی دیتے وقت جذبات سے مغلوب ہو کر کوتاہی کرے۔ مثلاً ایک انسان اس کی گواہی سے پھانسی چڑھ سکتا ہے' اس لیے اس کو اس پر رحم آیا اور گواہی بدل دی' یا مظلوم سے کوئی جذباتی لگاؤ ہے اس لیے ملزم کے خلاف گواہی بدل دی تاکہ اسے سزا ہو جائے۔ اسی بنا پر قرآن نے شرط رکھی کہ یہ گواہی تب معتبر ہے جب دوسری خاتون بھی اسی طرح گواہی دے۔ مشرقی جرمنی سے جاسوسی کے لیے مغربی جرمنی میں خوبصورت نوجوانوں کو بھیجا جاتا تھا۔ مغربی جرمنی کی خواتین' جو سرکاری محکموں میں کام کرتی تھیں' وہ ان سے

تعلقات قائم کرتے اور یہ خواتین ان جوانوں کی محبت سے مغلوب ہو کر ملکی راز ان کو بتا دیتیں۔ دوسری خاتون کی موجودگی میں غلطی کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

باپ بیٹی سے زیادہ محبت کیوں کرتا ہے؟

اس کی ایک بڑی وجہ مذہب کی تعلیم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ایک آدمی کو اگر اللہ تعالیٰ ایک بیٹی دے اور وہ اس کی اچھی پرورش کرے اور جوان ہونے پر اچھی جگہ اس کی شادی کی کوشش کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اسے جنت عطا فرمائیں گے۔ آپ ﷺ نے اپنے فرمان پر عمل کر کے دکھایا۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی بیٹی بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اتنی عزت کیا کرتے تھے کہ جب وہ آپؐ کے پاس تشریف لاتیں تو آپ ﷺ ان کے لیے اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔ دوسرے مذاہب کی تعلیمات بھی اس کے قریب قریب ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بیٹی بہت کمزور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری تاریخ اور موجودہ دنیا میں مرد کے ہاتھوں جتنا ظلم عورت پر ہو رہا ہے اس سے آدھا بھی عورت کی طرف سے مرد پر نہیں ہوا ہے اور نہ ہو رہا ہے۔ اپنے گھر میں بھائیوں کے مقابلے میں بے بس ہے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کو اتنا دکھ نہیں دے سکتا جتنا بہن کو دے سکتا ہے اور دیتا بھی ہے۔ اسی طرح شادی کے بعد شوہر کے گھر میں جتنی زیادتیاں بیویاں اٹھاتی ہیں اس سے آدھا بھی بیویوں کے ہاتھوں شوہر نہیں اٹھاتے۔ اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ اس کے دل میں کمزور کے لیے ہمدردی کے جذبات زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور جب معاملہ باپ اور بیٹی کا ہو تو ایسی مظلوم بیٹی کے ساتھ والد کی ہمدردی جتنی بھی زیادہ ہو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ہمدردی کی یہ دو وجوہات نرینہ اولاد میں نہیں' یعنی نہ شرعی تعلیم اس کے بارے میں اس طرح ہے اور نہ ہی وہ بیٹی کی طرح بے بس ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ بیٹے کی ذمہ داری بیٹی کی ذمہ داریوں سے بالکل مختلف ہے۔ مستقبل میں بیٹے نے کاروبار سنبھالنا ہے اور گھر کا نظام چلانا ہے' اس لیے اس کی تربیت والد کے ذمہ ہے' کیونکہ ان کاموں کے لیے والد ہی کی تربیت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ دوسری طرف بیٹے کے لیے باہر کی دنیا میں دیگر دلچسپیاں بہت زیادہ ہیں اور چونکہ ان میں منفی سرگرمیاں زیادہ ہیں جو بیٹے کے مستقبل کے تاریک بننے کے اسباب بن سکتی ہیں اس وجہ سے اس کی تربیت بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ذمہ دار اور حساس والد جب بیٹے کو منفی سرگرمیوں سے منع کرتا ہے اور مثبت سمت میں لانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں باپ اور بیٹے کے درمیان ٹکراؤ آ جاتا ہے اور اسی وجہ سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کے خلاف شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جو باپ اور بیٹے میں دوری پیدا کرتی ہے' جبکہ بیٹی کی تربیت اس طرح نہیں ہوتی ہے' اس لیے باپ اور بیٹی میں گلے شکوے بہت کم ہوتے ہیں' لہٰذا ان میں اسی تناسب سے دوری بھی کم ہوتی ہے اور ان میں فطری محبت برقرار رہتی ہے۔ بیٹے کی محبت متاثر ہے اور بیٹی کی غیر متاثر اور جب ان کا موازنہ کیا جائے تو بیٹی سے محبت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ محبت کی مختلف اقسام ہیں' مثلاً میاں بیوی کی محبت' والدین اور اولاد کی محبت' استاد شاگرد کی محبت' محسن اور ممنون کی محبت' دوست اور دوست کی محبت' پیر اور مرید کی محبت' سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں' لہٰذا باپ

اور بیٹی کے درمیان رحم‘ شفقت اور مہربانی کے تعلق کو ہم نے محبت سے تعبیر کیا ہے۔

بیٹی والد کا احترام کیوں کرتی ہے؟

آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ شریعت نے محرم رشتہ دار کے ساتھ نکاح کیوں حرام قرار دیا ہے؟ عقلی لحاظ سے دیکھیں تو یہ ممانعت ایک مسئلہ ہے۔ اس لیے کہ بچیوں کی شادی کے بارے میں والدین کی اکثریت بہت فکرمند ہے اور ان کی طرف سے اخبارات و جرائد میں ’’ضرورت رشتہ‘‘ کے اشتہارات بھی شائع کرائے جاتے ہیں۔ لیکن اشتہار کے ذریعے اگر ان کو رشتہ ملتا بھی ہے تو پریشانی پھر بھی ختم نہیں ہو جاتی‘ کیونکہ وہ اجنبی ہوتا ہے‘ جس کے اخلاق معلوم نہیں‘ کردار معلوم نہیں۔ اس لیے بہت بڑا خطرہ مول لیتے ہوئے بیٹی ان کے حوالے کرتے ہیں۔ جبکہ اس لڑکی کے گھر میں خوبصورت‘ باکردار‘ بھائی‘ چچا‘ ماموں یا کوئی اور رشتہ دار موجود ہوتا ہے‘ بلکہ وہ خود بھی مناسب لڑکی کی تلاش میں ہوتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کے حل پر شریعت نے کیوں پابندی عائد کر رکھی ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس حرمت میں متعدد حکمتیں اور مصلحتیں موجود ہیں‘ جن میں سے چند ایک آج کی سائنس نے بھی ثابت کی ہیں۔ مثلاً ایسے رشتوں سے موروثی بیماریاں اولاد میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ لیکن میں صرف ایک حکمت اور مصلحت بیان کرتا ہوں جو ہمارے موضوع سے مناسبت رکھتی ہے‘ اور وہ یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان اختلاف پیدا ہو سکتا ہے اور اس کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ اس صورت میں شوہر چونکہ طاقتور ہے اس لیے اپنا حق زبردستی وصول کر سکتا ہے‘ لیکن بیوی اپنا حق کس طرح وصول کرے‘ ایسے موقع پر لڑکی کے رشتہ دار آ کر اس کو ظلم سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے حقوق دلوانے کے لیے دباؤ ڈالتے ہیں۔ اب فرض کریں شوہر خاتون کا بھائی ہے اور ان میں اختلاف پیدا ہوا تو اس صورت میں خاتون کو حق کون دلوائے گا؟ اس قسم کی صورتحال سے بچنے کے لیے شریعت نے محرم سے نکاح حرام قرار دیا ہے۔ اس کے بعد یہ بھی ذہن میں رہے کہ بیوی کے رشتہ داروں میں سب سے پہلے اس کے دفاع اور حقوق دلوانے کے لیے والد میدان میں آتا ہے‘ باقی رشتہ دار والد کے کہنے پر سامنے آتے ہیں۔ بیٹی کو یہ سب معلوم ہے‘ اور ہو سکتا ہے کہ اس کے مشاہدہ میں بھی آیا ہو‘ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ گھر میں بھائی نے بہن کی حق تلفی کی ہو اور والد نے بیٹی کا ساتھ دیتے ہوئے بھائی کو منع کیا ہو۔ ان ساری باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بیٹی باپ کی عزت کرتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ گھر میں بیٹی کی ضروریات کی فراہمی میں بھائیوں کے مقابلے میں والد زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بیٹی کے مستقبل کا فیصلہ بھی اکثر باپ کے ہاتھ میں ہوتا ہے‘ یعنی بیٹی کی شادی کا اختیار والد کے پاس ہوتا ہے اور والد کا اخلاص اس سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ چنانچہ کبھی کبھی والد لالچ کا شکار ہو کر بیٹی کی زندگی متاثر کرتا ہے۔ یہ بات بیٹی کو معلوم ہے‘ اس لیے وہ والد کے احترام وغیرہ سے اس کی دلجوئی کی کوشش کرتی ہے۔

تیسری وجہ وہ ہے جو والد کی شفقت کے سلسلے میں‘ تیسرے نمبر پر درج کی ہے۔ یعنی بیٹی کی تربیت بیٹے کی طرح نہیں‘ یعنی کاروباری ذمہ داریوں کی بجائے اسے خاندانی ذمہ داریوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے

علاوہ بیٹی کی منفی سرگرمیاں بیٹے کی منفی سرگرمیوں سے مختلف ہیں' لہٰذا اس کی تربیت اور سرگرمیوں پر نظر رکھنا ماں کی ذمہ داری بنتی ہے۔ باپ بیٹی سے نہیں کہہ سکتا کہ اٹھو نماز پڑھو' کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس لیے نماز نہیں پڑھتی کہ پاک نہیں ہے اور اس بات کا علم باپ کو نہیں ماں کو ہوتا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر بیٹی اور باپ کے درمیان اختلاف کم ہوتا ہے' نتیجتاً گلے شکوے بھی نہیں ہوتے۔ ایسی صورت میں والد کی طرف سے شفقت اور بیٹی کی طرف سے عزت واحترام کا جذبہ صحیح سالم ہوتا ہے اور ماں کے مقابلے میں باپ کی عزت اور احترام زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ شروع میں ہم نے بتایا تھا کہ عورت میں جذبات شدید ہوتے ہیں اور اکثر عقل پر غالب آ جاتے ہیں' اس لیے مرد کے مقابلے میں عورت جذبات کے میدان میں ہمیشہ آگے ہوتی ہے' جس کی وجہ سے شریعت نے اس کی گواہی کو معتبر بنانے کے لیے دوسری عورت کی گواہی ضروری قرار دی تھی۔ یہی فطری خصوصیت اس کا سبب بن جاتی ہے کہ والد کے عزت واحترام میں بیٹی بیٹے سے آگے نکل جاتی ہے۔

ماں بیٹے کے ساتھ کیوں زیادہ محبت کرتی ہے؟

یہ بات یقینی نہیں کہ ہر ماں بیٹے سے بیٹی کے مقابلے میں زیادہ محبت کرتی ہے۔ کافی تعداد ماؤں کی ہمارے علم میں ہے جو بیٹے کی محنت مزدوری کی بچت بیٹیوں پر خرچ کرتی ہیں' یہاں تک کہ دوسرے بہانوں سے بیٹوں سے رقم لے کر بیٹیوں پر خرچ کرتی ہیں۔ بیٹی کی شادی کے بعد اس کے سسرال والوں کی اتنی خدمت کرتی اور خیال رکھتی ہیں کہ انسان حیران ہو جاتا ہے' اور یہ سب اس لیے تاکہ وہ میری بیٹی کو دکھ نہ دیں۔ ہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسی مائیں بھی ہیں جو بیٹے کو زیادہ ترجیح دیتی ہیں۔ اس کی وجہ مادیت کا غلبہ ہوتا ہے' یعنی یہ احساس کہ بیٹا خاندان کے ہر مسئلہ کے حل میں کردار ادا کرتا ہے۔ اس کردار کا تعلق خاندان کے دفاع سے بھی ہوسکتا ہے اور معاش سے بھی۔ اس کے علاوہ ماں اولاد کی جتنی محتاج ہوتی ہے باپ اتنا نہیں ہوتا۔ کیونکہ باپ کاروبار بھی کرتا ہے اور جائیداد بھی اکثر اس کے نام پر ہوتی ہے' جبکہ ماں کے پاس ایسے ذرائع بہت کم ہوتے ہیں۔ اس لیے ماں کا انحصار بیٹے پر زیادہ ہوتا ہے' جبکہ بیٹی سے اس قسم کی توقعات بہت کم وابستہ ہوتی ہیں۔ انہی مادی مفادات کی وابستگی کی وجہ سے اکثر خواتین بیٹی سے بہو کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں' کیونکہ بہو آ کر اس کا گھر آباد کرتی ہے جبکہ بیٹی جا کر دوسروں کا گھر آباد کرتی ہے۔ اس سلسلے میں پشتو زبان کا ایک بہت مشہور محاورہ ہے ''لور پردی دہ نرور کیر دی دہ'' یعنی بیٹی بیگانہ ہے اور بہو خیمہ ہے۔ اب جن خواتین کی نظروں میں بہو بھی بیٹی سے زیادہ اہمیت رکھتی ہو ان کی نظروں میں بیٹا بطریقِ اولیٰ پسندیدہ ہوگا۔ خاص طور پر بڑا بیٹا تو اور بھی ماں کی شفقت اور مہربانی کا مرکز بنا رہتا ہے' کیونکہ باپ کے بعد سب سے زیادہ ذمہ داری اسی پر آتی ہے۔ بڑے بیٹے کی اسی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بڑے بھائی کا حق دوسرے بھائیوں پر اتنا ہے جتنا والد کا حق اولاد پر۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بیٹی کی تربیت کا تعلق باپ کے مقابلے میں ماں سے زیادہ ہوتا ہے' کیونکہ امورِ خانہ داری ماں سکھاتی ہے جبکہ بیٹی اس میں سستی یا غلطی کرتی رہتی ہے۔ نتیجتاً ماں بیٹی میں اختلاف

پیدا ہوتا ہے' تکرار ہوتی ہے' اور وہی صورتِ حال یہاں بھی پیدا ہو جاتی ہے جو باپ اور بیٹے کے درمیان پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ چیز ماں اور بیٹی میں محبت' شفقت اور عزت و احترام میں بظاہر کمی کا باعث بنتی ہے۔ اسی طرح بیٹی کی منفی سرگرمیاں ماں کے علم میں آ جاتی ہیں اور یہ بھی تعلقات میں سرد مہری کا سبب بن جاتی ہیں۔ جبکہ ماں اور بیٹے میں اس طرح کے تعلقات کو متاثر کرنے والے عوامل نہ ہونے کے برابر ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ماں اور باپ کے درمیان وہی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جو باپ اور بیٹے کے درمیان ہوتا ہے' یعنی ماں کوئی کام کرنا چاہتی ہے' یا شوہر یا بیٹوں سے کرانا چاہتی ہے لیکن شوہر اختلاف کرتا ہے' اپنی بعض خواہشات کی تکمیل چاہتی ہے لیکن شوہر انکار کرتا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر بیوی شوہر سے دور اور بیٹوں کے قریب ہو جاتی ہے۔ ان خواہشات کی تکمیل بیٹے بھی شاید نہیں چاہیں گے لیکن ان کو اختلاف کے اظہار کی ضرورت اس لیے نہیں پڑتی' کیونکہ باپ نے پہلے سے انکار ظاہر کیا ہے' اس لیے ماں کے غصہ اور ناراضگی سے بچ جاتے ہیں۔ ویسے بھی باپ کے برعکس بیٹا ماں کی مرضی کا لحاظ زیادہ رکھتا ہے' کیونکہ وہ ماں کے پاؤں کے نیچے جنت تلاش کر رہا ہوتا ہے' یہاں تک کہ بعض اوقات ماں کی غلطی یا غلط خواہش پر بھی خاموشی اختیار کرتا ہے۔ ماں کی نافرمانی سے بچنے کی خاطر اس کی بات پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عورت شوہر کے مقابلے میں بیٹے کو زیادہ دلیری سے حکم دیتی ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر ماں بیٹے کے درمیان قربت میاں اور بیوی کے مقابلے میں زیادہ نظر آتی ہے۔

بیٹا ماں سے بیٹی کے مقابلے میں کیوں زیادہ محبت کرتا ہے؟

مذکورہ بالا سطور سے خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بیٹا ماں سے بیٹی کے مقابلے میں کیوں زیادہ عزت و احترام کرنے والا معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بات ہر جگہ درست ثابت نہیں۔ کیونکہ مشاہدہ اس بات کی تائید کرتا ہے کہ بہت ساری بیٹیاں ماں کا عزت و احترام اور خدمت نرینہ اولاد سے بہت زیادہ کرتی ہیں اور یہ عمل اپنی سعادت سمجھتی ہیں۔ لیکن جہاں بیٹا زیادہ مہربان نظر آتا ہے وہاں وجہ یہ ہے کہ ماں شدّتِ شفقت کی وجہ سے ہر معاملے میں بیٹے کا ساتھ دیتی ہے' یہاں تک کہ اپنے شوہر کو بیٹے پر غلطی کی وجہ سے اعتراض کرنے سے روکتی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر بیٹے اپنی ہر خواہش کا اظہار باپ کے بجائے ماں سے کرتے ہیں اور اکثر باتیں ماں کے توسّط سے والد تک پہنچاتے ہیں اور باپ سے منوانے کے لیے ماں کو استعمال کرتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ماں اور بیٹے کے درمیان اتنا اختلاف نہیں ہوتا جتنا ماں بیٹی کے درمیان ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے ماں بیٹے کی تربیت میں اتنی زیادہ مؤثر نہیں ہوتی جتنی بیٹی کی تربیت میں ہوتی ہے' اس لیے ان کے درمیان ٹکراؤ اور ناراضگی کم ہوتی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ مذہب کی تعلیمات اور معاشرے کا رجحان اس طرف بہت زیادہ ہے اور ماں کی خدمت اس کی فرمانبرداری اور اس کی دلجوئی دنیا و آخرت کی کامیابی سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے

(باقی کیسر 64 پر)

انجمن خُدّام القرآن (قرآن اکیڈمی) سندھ کراچی

کے تحت

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے جاری کردہ

قرآن فہمی کورس پارٹ I اور II

میں سال 12-2011ء کے لیے داخلوں کا اعلان

جدید تعلیم یافتہ حضرات وخواتین کے لیے علومِ دینیہ کی تحصیل کا نادر موقع!

پارٹ I

- علم تجوید
- آسان عربی گرامر
- مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب
- ترجمۂ قرآن حکیم
- سیرت النبی ﷺ
- دورہ ترجمۂ قرآن
- مطالعۂ حدیث
- عقائد وعبادات
- اسپیشل لیکچرز
- کلام اقبال

پارٹ II

- علم تفسیر
- علم حدیث
- علم فقہ
- اصولِ تفسیر
- اصول حدیث
- اصول فقہ
- عقیدہ
- عربی زبان وادب
- تحریکیات
- اضافی محاضرات

- پارٹ I اور پارٹ II دونوں ایک ایک سال کے دورانیے پر مبنی ہیں
- **آغاز: 19 ستمبر 2011ء**
- خواتین کے لئے شریعت کے مطابق باپردہ اہتمام
- پارٹ I میں داخلے کے لئے انٹرمیڈیٹ یا مساوی سند درکار ہوگی
- پارٹ II میں داخلے کے لئے پارٹ I یا مساوی سند لازمی ہے
- اہل طلبہ کے لئے مناسب اسکالرشپ

- شہر کے باہر سے آنے والے طلبہ کے لئے محدود تعداد میں ہاسٹل اور میس کی سہولت موجود ہے

نوٹ: ہاسٹل/میس کی سہولت قرآن اکیڈمی یاسین آباد میں صرف حضرات کے لئے دستیاب ہے۔ اسی طرح فی الوقت پارٹ II کا کورس بھی صرف حضرات کے لئے یاسین آباد اکیڈمی میں منعقد کیا جارہا ہے۔

مقاماتِ تدریس:

1. قرآن اکیڈمی ڈیفنس، مسجد جامع القرآن خیابان راحت فیز 6 درخشاں ڈیفنس، کراچی 23-35740022-021
2. قرآن اکیڈمی یاسین آباد، شارع قرآن اکیڈمی، بلاک 9، فیڈرل بی ایریا، کراچی 021-36806561
3. قرآن مرکز گلستان جوہر، مسجد باب القرآن، سالکین بسیرا، بلاک 14 کراچی 021-34255995

مزید تفصیلات، پراسپیکٹس اور داخلہ فارم ویب سائٹ سے حاصل کریں www.quranacademy.com

THE PROCESS OF CREATION
A QUR`ANIC PERSPECTIVE

(3)*

Original Text in Urdu by **Dr. Israr Ahmad**
Rendered into English by **Dr. Absar Ahmad**

ENMITY OF SATAN TOWARDS THE HUMAN BEINGS: THE BATTLE BETWEEN GOOD AND EVIL

The narrative of Adam and Iblees has been mentioned at seven different places in the Holy Qur`an. The last part of these verses is of special significance as it points out a potent factor causing perennial strife and conflict between good and evil and Truth and falsehood going on in the human world viz. Satan's enmity towards Adam and his progeny and acting as an invisible powerful agent in misleading man and throwing him out of the way. The cursed Satan, after becoming an abominable agent on disobeying Allah's command, asked for respite till the time humans are raised up on the Day of Judgement and that was granted to him. Iblees not only refused to bow down, he refused to be of those who bowed down. In other words, he arrogantly despised the angels who bowed down as well as man to whom they bowed down and he was in rebellion against Allah for not obeying His order. Arrogance, jealousy, and rebellion were his triple crime. Thus in a very egotistic and arrogant manner he openly declared his enmity and lasting war against Adam and his progeny. Out of the seven places, in three places the enmity of Satan has been pointed out by Allah Himself thus:

i) Ayah 36 of Surah *Al-Baqarah* reads:

> "….. We said: Get ye down, all (ye people) with enmity between yourselves ….." [2:36]

ii) In Surah *Ta Ha*, initially Ayah 117 states:

> "Then We said: O Adam! Verily this is an enemy to thee and thy wife ….." [20:117]

And later on in words very similar to those of Surah *Al-Baqarah*, we read in Ayah 123:

> "He said: Get ye down, both of you --- all together, from the Garden, with enmity one to another ….." [20:123]

---

* Part II was published in "Hikmat e Quran" October-December 2010.

iii) In Surah *Kahaf*, however, Allah reports this in a manner of complaint in these words:

> "….. Will ye then take him (i.e. the Satan) and his progeny as protectors rather than Me? And they are enemies to you! Evil would be the exchange for the wrongdoers!" [18:50]

At other places, the cursed Satan expresses his aggressive and deceptive designs against Adam and his progeny in a very challenging manner:

i) "….. I will bring his (i.e. Adam's) descendants under my sway --- all but a few!" [*Al- Isra*; 17:62]

ii) "(Iblees) said: Then by Thy power, I will put them all in the wrong --- except Thy servants among them, sincere and purified (by Thy grace)." [*Sa`d*; 38: 82, 83]

iii) And in Surah *Al-Hijr*, we read:

> "(Iblees) said: O my Lord! Because Thou hast put me in the wrong, I will make (wrong) fair-seeming to them on the earth, and I will put them all in the wrong --- except Thy servants among them, sincere and purified (by Thy grace)." [15: 39, 40]

iv) And the most elaborate statement is made in two verses of Surah *Al-A`raf*:

> "He (Satan) said: Because Thou hast thrown me out of the way, Lo! I will lie in wait for them on Thy straight way. Then I will assault them from before them and behind them, from their right and their left. Nor wilt Thou find, in most of them, gratitude (for Thy mercies)." [7: 16, 17]

Thus evicted from paradise, Satan vowed to seduce humankind from the straight path. He continues to deceive them with false promises, and temp them away from "the path made straight"; he makes it appear crooked. While Allah creates and beautifies the world, Iblees defaces creation and makes evil conduct look deceptively beautiful. He is the persistent sceptic and rebel who questioned and disobeyed Allah when He ordered him to bow to Adam, Allah's deputy or vicegerent on earth. The slinking evil whisperer, as the Qur`an calls him in its final Surah famous for its onomatopoetic effect, is hell-bent on misguiding humankind away from Allah and uses every nefarious strategy as he and his evil tribe spy on Adam's progeny. He has misled a vast multitude (36:62) of humankind. The foolish repudiation of the sovereignty of the compassionate Allah, at the instigation of the Satan, is the centerpiece of the Quran's account of human condition and history.

The above lines give clear guidance and knowledge with regard to the strife and conflict between good and evil that takes place both in the inner denizens of human self and the outer or external conflict. On the internal side, the strife is between the two components of his own being, viz. the animal instincts and the pure spiritual ego or soul. The animal part of man is ruled entirely by the lower instinctual desires, lusts and carnal indulgence that press for immediate gratification and thus always lead to immoral behaviour. These have no consideration at all whether the fulfillment is achieved by means of permissible means or otherwise. Part of Ayah 53 in Surah *Yusaf* refers to this in these words, explaining at the same time the nature of *nafs-e-ammarah*:

> "I do not absolve my own self (of blame); the human (lower) self is certainly prone to evil ….." [12:53]

The majority of commentators construe this verse to mean that Joseph was referring to his fidelity to the Aziz, although he was human and liable to err. *Ammarah* is that part of human self that prompts to immoral act and thus is prone, impelling, headstrong and passionate. In the Qur`an, one reads about these states or stages of the development of the human soul. *Ammarah*, which is prone to evil, and if not checked and controlled will lead to pevolition; *Lawwamah* which feels remorse on evil, and resists it, asks for Allah's grace and pardon after repentance and tries to amend; it hopes to reach salvation; *Mutmainnah*, the highest stage of all, when it achieves full rest and satisfaction. The second stage, i.e. *nafs-e-lawwamah* may be compared to conscience, except that in English usage, Conscience is a faculty and not a stage in spiritual development. As a modality of inner self which condemns immoral activation, it comes very close to the Qur`anic characterization of it.

The moral and religious life of human beings is in fact a constant struggle and tussle between his lower or animal self and the higher or spiritual self. As far as the external battlefield of this strife in society is concerned, there are two agents of goodness and similarly two agents of evil. The one in each is physical perceptible viz. those human beings who invite and encourage us towards moral acts and, on the other hand, those evil persons who mislead and lure us to immorality and sin. The other agent is invisible and non-physical in both cases: in moral and pious acts, angels strengthen the good people; they will have their friends and protectors in the good angels who give them glad tidings. On the other hand, the Satan and his progeny and acolytes mislead and waylay humanity.

Our life in this world, according to the Qur`an, is a probationary period so that Allah may test our actions and perseverance. A believer has to prove his fidelity to Allah resisting against the evil temptations and lures induced by Satan. Satan and his progeny (especially from the jinns) have a privilege that, being invisible, they attack and present a snare for human beings from a

place from where they cannot take notice of them, as the Qur`an says in Surah *Al-A`raf*:

> "… for he (Satan) and his tribe watch you from a position where ye cannot see them." [7:27]

A Hadith of the Holy Prophet ﷺ further elaborates the strategy of Satan according to which Satan enters the inner denizens of human self as the blood rotates in the interior of the body. Even if we take this Hadith as a metaphor, it makes perfect sense insofar as Satan prompts us to do the evil from our interiority, as Qur`an asserts:

> "… (Seek refuge) from the mischief of the Whisperer (of evil) who withdraws after his whisper, who whispers into the hearts of mankind." [*Al-Naas*; 114:4, 5]

The inward whispering of Satan stirs the evil and vicious tendencies of man and thus influences his entire being. Thus, Satan and his progeny penetrate and pierce man's inmost psyche and exercise complete control over it, turning it towards sin and impiety. The literal meaning of above-mentioned Hadith too is quite understandable since jinns have been created from fire and it is a finer material as compared to clay. They can assume different forms. Similarly, it is not too difficult to believe that they can lodge, penetrate and rush into other human bodies.

On the other side of the spectrum is the protection and guarantee of safety Allah provides to believers against the devilish machinations of Satan and his agents. This, in effect, means that those who become bondsmen of Allah with sincerity and utmost purity of heart and intention are saved from falling prey to Satan. From amongst the human beings only those are influenced by Satan who has, instead of attending to the dictates of higher spiritual self, accepted and given in to the basal promptings of *nafs-e-ammarah* and subservience to it. This has been explicitly stated in Surah *Al-Hij`r* and Surah *Al-Isra* in these words:

i) "For over my servants no authority shall thou have except such as put themselves in the wrong and follow thee." [15:42]

ii) "As far My servants, no authority shall thou have over them. Enough is thy Lord for a disposer of affairs." [17:65]

However, as already explained above with reference to the verses of Surah Sa`d and Surah Al-Hij`r, Satan admitted his complete failure to mislead and waylay those sincere and dedicated bondsmen of Allah who through sincerity and purity of motive have been declared *mukhlas*.

In the history of humankind, until the time the role of the individual dominated over society or group, the conflict between good and evil too

concentrated on the internal and external fronts of individuals. However, over the last three hundred years, the world has witnessed a radical change and transformation. On the one hand, man has acquired greater awareness of his rights and importance. Secondly, various scientific inventions ushered in the industrial revolution. Thirdly, great strides were taken in the development of science and technology and progress in this was achieved with tremendous speed. Allama Iqbal, along with many intellectuals of 20th Century, has eloquently referred to this scientific-technological progress of man and his controls over the forces of nature. But this progress at the material level had no parallel improvement and progress at the level of morals and social relations among people. In fact, Satan was extremely active throughout this historical epoch and with the help and cooperation of his agents among human beings, made evil rampant in all spheres of human life: social, economic and political. Through promoting extremism and lack of moderation, corrupt and immoral conduct and ideological and practical falsehood and deception, Satan has succeeded in pressing the influence of evil in the far reaches of social life and civilizational fabric. And it is a fact that the main agent who is corrupting and morally vitiating the entire spectrum of human life in its multi-dimensional spheres is the Satan, called Lucifer in the religious literature of Christendom. It is in this very context that William Guy Kerr, the eminent American writer, agrees with this assertion in his work "Pawns in the Game". The book has been read with tremendous interest by thoughtful readers across the world.

William Guy Kerr explains graphically how Satan laid down his devilish snare in humanity about two and a half century ago by means of the "Order of the Illuminati" in the West. Its agenda was further promoted by "Free Masonry" and similar other organizations. This was taken up in due course of time about 140 years ago by "Elders of the Zion" who achieved their envisioned targets first through the WASP (White Anglo-Saxon Protestants) in the form of Balfour Declaration (1917) and finally in the creation of Israel in 1948. After fully dominating the Christian world the satanic onslaught is advancing with full speed and zest towards the entire globe under the banner of "New World Order" advocating irreligious liberal programme of sinful nudity, free sex and immorality. All these activities are supported, according to the agents of Satan, by the so-called Charter of Human Rights. However, we Muslims believe that according to the Qur`anic verse:

> "And (the unbelievers) plotted and planned, and Allah too planned, and the best of planners is Allah." [*A`le-Imran*; 3:54]

The final victory will be of Truth and Deen al-Haq. The last showdown between the Good and Evil has been referred to in the Bible as "Armageddon" and in the Hadith as a colossal war or "*Malhama al-Uzma*" in which millions of human beings will be massacred and put to death. Allama

Mohammad Iqbal, the visionary sage, too had glimpse of this final clash. Let us look at representative verses in this regard:

The soul and body yet face a clash,
This culture has made her wild beasts rash.
Allah has faith in *momin's* might and will,
On Europe's hardware, Satan makes his skill.
("Advice of Old Baloch to His Son": *Armaghan-e-Hijaz*)

But here we Muslims must recall the truth stated categorically about the final victory of Truth:

> "And say: Truth has (now) arrived, and Falsehood perished. For Falsehood is (by its nature) bound to perish." [*Al-Isra*; 17:81]

From its nature, falsehood must perish for it is the opposite of Truth, and Truth must ever prevail. Only this Qur`anic assurance and authentic prophetic, traditions provide the panacea for the cynicism and extreme pessimism shown by a large majority of Muslims (who only pay lip service to Islam) in view of the current global domination of the forces of evil and crass materialism.

THE DEVELOPMENT OF EMBRYO IN MOTHER'S WOMB FROM FOETUS TO ITS CROWNING WITH FULL ADAMIC STATURE --- A MICROSCOPIC VIEW OF THE LONG PROCESS

Life began on Earth, as has been explained in the earlier sections of the essay, with a microscopic amoeba consisting of a single cell, i.e. it was initially unicellular and then it passed through an evolutionary process extending over millions of years to develop into Homo sapiens. The crowning of one of three (through infusion of Divine breath i.e. spirit or *rooh*) has already been discussed above. Later on, proliferation of human race took place exactly on the pattern of all living beings, viz. through copulation and cohabitation of the male and the female. However, unlike the development birth of all other living species, a special event or phase characterizes the human embryo in the mother's womb: its crowning with spirit or *rooh* exactly on the pattern of Adam. Its "*rooh*" is brought forth from the repository (where it was kept in a dormant state) and aligned with the living embryo. The stages of the development of human embryo starting from the fertilization of ovum (zygote) to a fully developed baby pointed out in the description contained in a number of verses of the Qur`an has surprised a good many top experts of embryology. In particular, mention here must be made of the two eminent Canadian professors of embryology at the University of Toronto viz. Dr. Keith L. Moore and Dr. Robert Edwards. While Dr. Keith L. Moore is a leading expert of the subject and two of his

research publications are studied as textbooks in many medical universities around the world, the latter is a world-renowned expert of test-tube baby reproduction. Both of them express their utter amazement at the scientifically correct Qur`anic description of the development of human fertilized ovum in the mother's womb taking the form of a zygote and then gradually developing into embryo with all limbs and organs. The Qur`anic description given more than 14 centuries ago is fully corroborated by scientific researches done very recently after the invention of microscope and other imaging equipment.

Though the verses of the Qur`an describing the stages of human foetus' development are numerous, the topmost in detail and depth among them are verses 12 to 14 of Surah *Al-Mu`minun*. Here the creation of man is initially described as consisting of four stages, which are differentiated with the word *thumma* ("then") pointing to a next stage of growth and development. The third of these stages is further divided into four sub-stages by means of the word *fa* ("only"). This means that in three verses, we thrice read the word *thumma* and thrice *fa*. The translation of the verses is worth noting:

> "Man We did create from a quintessence (of clay); then We placed him as (a drop of) sperm in a place of rest, firmly fixed; then We made the sperm into a clot of congealed blood; then of that clot We made a (foetus) lump; then We made out of that lump bones and clothed the bones with flesh; then We developed out of it another creature. So blessed be Allah, the Best of creators."

The first verse out of the above beautiful passage of three verses --- Man We did create from a quintessence (of clay) --- refers to a major and long phase of the creative work of Allah. In the earlier sections of this monograph, we have already discussed and expounded in the Qur`anic perspective the earliest stage of creation in which the creation of primeval matter out of nothing (*ex nihilo*) took place. It is also a process of creation when inorganic matter becomes or assumes the properties of living matter. Thus, inorganic constituents of the earth are absorbed into living matter by way of food and living matter reproduces itself by means of sperm. The next verse --- then We placed him as (a drop of) sperm in a place of rest, firmly fixed --- refers to the activity when the sperm is deposited in the ovum and fertilizes it and rests for a time in security in the mother's womb. The semen or fertilized sperm is protected in the mother's womb like a king in a castle; it is firmly fixed and gets the protection of mother's body, on which it depends, for its own growth until birth. Verse 6 of Surah *Zum`r* explains this:

> "He makes you in the womb of your mothers in stages, one after another, in three veils of darkness." [39:6]

Then we are told about the details of the third major phase in the development of the foetus which itself goes through four sub-phases viz.

i) Then we made the sperm into a clot of congealed blood;
ii) Then of that clot, We made a (foetus) lump;
iii) Then We made out of that lump bones
iv) and clothed the bones with flesh

The first change in the fertilized ovum is the conversion into a sort of clot of thickly congealed blood; the zygote cells grow by segmentation; then the mass gradually assumes shape in its growth as a foetus. From the lump develop bones, flesh, organs and nervous system.

So far human baby's growth in the mother's womb is exactly like that of an animal, but then a further event takes place which makes the infant animal in the infant man. And, this part of the verse, quite significantly, starts with the word *thumma* also which, according to Arabic grammar, refers to a new phase or "turn" after a considerable gap in a long preceding process. And this is the last major and momentous change in the (so far) animal-like embryo which turns it into a human infant with all its capacities and responsibilities. Let us again look at the translation of this part of the verse: "… then We developed out of it another creature or brought him into being as another creature." And the verse ends with the words: "So blessed be Allah, the Best of creators". According to a great many exegetes, this last phase refers to breathing of Allah's spirit into the embryo, as is stated very clearly in verse 29 of Surah *Al-Hij`r*:

> "When I have fashioned him (in due proportion) and breathed into him of My spirit, fall down in obeisance to him."

Moreover, according to verse 44 of Surah *Al-Nahal* it is the vocation of the Prophet Muhammad ﷺ to explain the meaning of Qur`an. The verse ends:

> "And We have sent down unto thee the Message; that thou may explain clearly to men what is sent for them…"

So instead of thinking on our own and making conjectures on this point, it is best to look for guidance and wisdom from the sayings of the Holy Prophet ﷺ. Here an authentic Hadith contained both in Bukhari and Muslim helps us tremendously. On the authority of Abu Abdul Rahman Abdullah Ibn Masood ص who said: The Messenger of Allah ﷺ and he is the truthful, the believed, narrated to us:

> "Verily the creation of each one of you is brought together in his mother's belly for forty days in the form of seed, then he is a clot of blood for a like period, then a morsel or lump of flesh for a like period, then there is sent to him the angel who blows spirit (*rooh*) into him…"

It is this spirit that makes the embryo thoroughly human. Prior to this, the embryo was a piece of living flesh and hence had an animal existence only. The union with the soul is the transition from a mere animal existence to a fully human one. This blowing of spirit or *rooh* is indeed the crowning of the living animal embryo that places him --- by making him ensouled --- on the high and dignified station of a human person, a member of Adam's progeny. Prior to this super-addition of soul, the embryo or foetus developed and passed through various stages just like an animal foetus. We can only regret that quite a few religious scholars (who are totally ignorant of modern scientific knowledge and in particular of biology) take the last phase to mean infusion or breathing of life in the foetus. The fact, on the contrary, is that not only the fertilized ovum developing in the womb, its constituents in the form of spermatozoa (from male parent) and ovum contributed by the female have already the property of life. Neither the spermatozoa are dead, nor the ovum coming from the mother is dead. In particular, the "sperm" of male parent is not only living, it is jumping and hitting with force and zest. To sum up: it is the addition of the spiritual element or *rooh* into the already living foetus that makes it truly human or homo cum deo. (*To be continued*)

MESSAGE OF THE QUR'AN

Continued from page 87

(164) On the Day of Judgment, when every soul will be confronted with whatever good it has done - as for its evil deeds, it will wish they were a long way off. Allah warns you to have His fear. Allah is full of kindness for His devotees.

On the Day of Judgment, every soul shall be paid back in full what it had earned in this world. Those who devoted themselves to Allah's worship and obedience will get their just reward from Him, while those who had committed evil deeds will be in a state of terror and will be wishing to somehow distance themselves from those deeds. Allah admonishes us to fear Him and at the same time lets His devotees know that He is compassionate towards his servants.

❍ ❍ ❍

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

#

Aal-e-Imran

(Ayaat 1- 30)

Introduction

As mentioned in the introduction, most of the *surah*s of the Holy *Qur'an* are in the form of pairs, thus *surah Aal-e-Imran* and *Al-Baqarah* also form a pair and there are a lot of similarities between the two *surah*s. The Prophet (SAW) named these الزَّهْرَاوَن *"The two most Shining lights"* and according to a *Hadith* narrated by *Abdullah Bin Buraydah* from his father, the Prophet (SAW) said:

"Learn Surah Al-Baqarah and Aal-e-Imran because they are two lights which will shade their people on the Day of Resurrection, just as two clouds, two spaces of shade or two lines of (flying) birds." [1]

Aal-e-Imran, like *Al-Baqarah*, was revealed in *Madinah* and contains two hundred *ayaat* and twenty *ruku's* which are divisible into two parts with ten *ruku's* in each part. The first part is further divisible into three sections with the middle section addressing the People of the Book. In the middle section of *surah Al-Baqarah*, Allah (SWT) addresses the Jews whereas in this *surah*, the main address is to the Christians who are admonished to give up their erroneous beliefs and accept the guidance of the *Qur'an*. There is a difference of more than a year between the revelation of *Al-Baqarah* and *Aal-e-Imran*. Most of this *surah* was revealed after the battle of *Uhad* while *surah Al-Baqarah* was revealed before the battle of *Badr*. The events of the *battle of Uhad* are described and commented upon in the last part of this *surah*.

---

[1] Musnad Ahmed 5:352, also recorded by Ibn Majah 2:1242

Translation and Brief Elucidation

الٓمّٓ ①

(1) Alif, Laam, Meem.

This *surah*, like *Al-Baqarah,* also begins with these words and there are a total of six *surahs* in the Quran which begin with these letters.

اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ②

(2) Allah. There is no Allah but He, the Living the Eternal.

This *ayah* has already been described in the commentary of *Ayat-ul-Kursi* in *Al-Baqarah*. It states that there is none worthy of worship except Allah (SWT) and He is *Al Hayy* and *Al-Qayyum*, the Ever Living, the One who never dies, who sustains and protects all that exists. He Himself is independent and self-sufficient and all the Creation stands in need of Him and totally relies on Him.

نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ وَاَنۡزَلَ التَّوۡرٰىةَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ ③

(3) It is He Who has sent down the Book to you with truth, confirming what went before it; and He sent down the Torah and the Injeel.

This means that Allah (SWT) has sent down this Book i.e. the *Qur'an* to Prophet Muhammad (SAW) with truth and with *Haq* i.e. with a true purpose, and it has come confirming the truth of those scriptures which were present before the *Qur'an* was revealed, and it also confirms that Allah (SWT) Himself had sent down *Torah* and *Injeel* to his Prophets *Musa* (AS) and *'Isa* (AS) respectively.

مِنۡ قَبۡلُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَاَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ ④

(4) Before this, as a guide to mankind and He sent down Al-Furqan. Surely those who reject Allah's revelations will be sternly punished. Allah is Mighty, capable of retribution.

i.e. Allah (SWT) sent down the previous scriptures before the *Qur'an* as a guidance for mankind *"and He sent down Al-Furqan"* i.e. the criterion to differentiate between falsehood and truth, deviation and guidance. It is the distinction between misguidance and deviation on the one hand, and truth and piety on the other. *"Surely those who reject Allah's revelations will be sternly punished"* Whoever denies and rejects His revelations will receive painful torment on the Day of Resurrection. And remember that *"Allah is Mighty, capable of retribution"* i.e. His sovereignty is Infinite, and He is Omnipotent and All-Powerful to take revenge.

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخۡفٰی عَلَیۡهِ شَیۡءٌ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ⑤

(5) From Allah verily nothing is hidden on earth or in the heavens.

Allah (SWT) has perfect knowledge of the whole universe and nothing in it, be it on earth or in the heavens, is hidden from Him.

هُوَ الَّذِیۡ یُصَوِّرُکُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ کَیۡفَ یَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ۝۶

(6) It is He who shapes you in the wombs as He pleases. There is no Allah but He, the Exalted in might, the Wise.

It is He who creates and fashions you in the womb of the mother as He wills, whether male or female, black or white, wealthy or poor. This *ayah* reiterates the central theme of the *Qur'an* i.e. *Tawhid* that none has the right to be worshipped except Him and no one is to be obeyed independent of Him. And He is *'Al Aziz'*, meaning thereby that he has absolute authority. He is also *'Al Hakeem'*, i.e. along with having total authority and power, He has absolute wisdom and He uses His authority wisely and judiciously.

هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَ ابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِهٖ ۚ وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝۷

(7) He is the One who has revealed to you the Book. Some of its verses are entirely clear - they are the foundation of the Book - while others are allegorical. Those whose hearts are infected with disbelief follow the allegorical part to mislead others and to give it their own interpretation, seeking for its hidden meanings, but no one knows its hidden meanings except Allah (SWT). Those who are well grounded in knowledge say: "We believe in it; it is all from our Lord. None will take heed except the people of understanding.

This *ayah* is very important for the correct under-standing of the *Qur'an*. There are certain *ayaat* that are absolutely clear and precise in their meanings and connotation and serve as corner stone for the Islamic law (*Shari'a*). These have been labeled as *muhkamaat* - meaning fortified and absolutely self-evident with no ambiguity. On the other hand there are certain *ayaat,* called *mutashabihaat* that are allegorical in nature and fall in the category of the unseen, *Al-ghaib*, of which only Allah (SWT) has the knowledge e.g. the angels, the Hereafter, Paradise and Hell and the Day of Judgment. To describe the things which are beyond the reach of human perception, Allah (SWT) has used metaphors, similes and allegories and as such these can be interpreted differently by different people. There can be difference in the interpretation of the *ayaat* that are *mutashabihaat* because they are allegories and hence those who are misguided and deviants from truth try to make false interpretations of these *ayaat*, so as to misguide people, whereas the exact meaning and interpretation of these *ayaat* is far from the reach of human understanding. On the other hand, those who have been endowed with deep knowledge abstain from ambiguous interpretations of these

ayaat and believe in the obvious meaning without probing much into them and believe that only Allah (SWT) has the perfect knowledge of these *ayaat*. There is a saying in Persian: *"In the end most of the learned people are forced to say that now I know that I know nothing."*

According to *surah Al-Baqarah*, the first condition for a believer to benefit from the guidance of the *Qur'an* is to believe in the *Unseen*; a reality which is beyond the range of human perception and thus cannot be grasped mentally with the limited means and intellect at our disposal. That is why Allah (SWT) says: *"None will take heed except the people of understanding."* Only the really and genuinely wise take heed.

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝٨

(8) They say: "Our Lord, Do not cause our hearts to deviate now after you have guided us. Grant us Your own mercy. Truly, You are the Bestower.

This is the prayer of those the faith of whom is based firmly on knowledge. The aim and purpose of their lives in this world, a temporary and transient abode, is to make preparation for the eternal life of the Hereafter. So they pray to Allah (SWT) not to make their hearts deviate like the hearts of those who follow their own desires, and beg for His mercy. And they say: *"Truly, You are the Bestower"* i.e. it is only You who can guide us.

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝٩

(9) Our Lord, You will surely gather all mankind before You on the Day about which there is no doubt; surely Allah (SWT) never fails to fulfill His promise.

They are sure of their eventual return to Allah (SWT) when all disputes will be resolved and all realities will appear in full. Allah will surely gather all mankind before Him on a day that is bound to come and He does not break his promises.

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝١٠

(10) Those who reject faith neither their possessions nor their progeny will avail them aught against Allah (SWT): they are themselves but fuel for the fire.

This means that those who reject what Allah (SWT) has revealed to His Prophet (SAW) and thus deviate from the truth will get no help from either their progeny or their wealth on the Day of Judgment and they will be the wood with which Hellfire will be kindled. Those who disbelieve, neither their riches nor their children shall in the least save them from Allah's punishment.

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝١١

(11) (Their end will be) no better than that of the people of Pharaoh and their predecessors: they denied Our Signs and Allah (SWT) called them to account for their sins. For Allah (SWT) is strict in punishment.

i.e. the disbelievers will meet the same fate that was the destiny of Pharaoh and his followers and of the earlier nations which rejected Allah's signs and His Messengers. Thus He will give them the severest of punishments on the Day of Judgment.

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾

(12) Say to the unbelievers: "Soon you will be overpowered and driven together to Hell, which is a horrible refuge"

Allah (SWT) commanded the Prophet (SAW) to proclaim to the disbelievers who rejected his Prophethood, that they would be defeated and would be overpowered in this world and in the Hereafter will be driven into the Hellfire which is indeed a horrible resting-place.

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِى الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

(13) Indeed there was a sign for you in the two armies which met on the battlefield: one was fighting for the cause of Allah and another disbelieving; whom they saw with their own eyes as twice their number. But Allah (SWT) strengthens with His own aid whom He pleases. Surely there is a lesson in this for those who have eyes.

This refers to the battle of *Badr* which had been fought prior to the revelation of this *ayah*. Three hundred and thirteen Muslims were set to fight one thousand strong *Quraysh* army, more than thrice their number, but by Allah's will, the Muslims envisioned the non-believer army only as twice their strength. Thus the Muslims felt at ease that the odds were not heavily stacked against them. *"But Allah (SWT) strengthens with His own aid whom He pleases. Surely there is a lesson in this for those who have eyes"* i.e. this is a clear proof for the unbelievers that Allah (SWT) is always on the side of the believers and a clear sign for them to see how they are placed in this world and what fate awaits them in the Hereafter. Allah (SWT) strengthens with His aid whom He pleases. Surely in this is a lesson for the discerning.

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

(14) Alluring unto men is the enjoyment of the worldly desires through women, children and heaped-up hoards of gold and silver, and branded horses, and cattle, and fertile land. These are the pleasures of this world, but the most beauteous of goals is with Allah.

Allah (SWT) has made this world a place of trial and has placed delights and pleasures in it as a test for the mankind. These transient worldly things make a person oblivious of the realities pertaining to the next life and he no longer remembers the fact that the most excellent reward, which is far better than all the temporary delights of this short life, is with Allah (SWT).

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾

(15) Say: "Shall I tell you of better things than these. For the righteous there will be gardens beneath which rivers flow, where they will live forever with purified spouses and the good pleasure of Allah. Allah is seeing His servants very closely."

i.e. these worldly things which allure you are only the glitters of this present life and will be of no use in the next life. But those who make the Hereafter their center of attention and are desirous of the next life instead of these earthly delights, Allah (SWT) informs them of great rewards in the Hereafter. They will have gardens with rivers flowing and spouses freed from impurity and they will receive the grace of their Lord, which is indeed the supremest bliss conceivable.

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾

(16) Those who pray: "Our Lord! We have indeed believed in You, so forgive our sins and save us from the agony of the Hellfire."

The believers who will be blessed with the rewards mentioned in the preceding *ayah* are those who supplicate to their Lord admitting that they truly believe in one and only Allah and ask for forgiveness of their sins and faults and appeal to be saved from the Hellfire depending upon His bounty and mercy.

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

(17) The patient, the true believers, the obedient and those who spend, and who pray for forgiveness in the last hours of the night.

True believers who shall be rewarded are those who show patience when faced with adversity, are steadfast in avoiding prohibitions and obedient in worshipping Allah (SWT). They spend in Allah's cause and seek His forgiveness in the last part of the night.

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾

(18) Allah bears witness that none has the right to be worshipped but He and so do the angels and those who are well grounded in knowledge standing firm on justice. None has the right to be worshipped except He, the All-Mighty, the Wise.

Allah (SWT) Himself is testifying that He alone is the Lord of the universe and there is no deity worthy of worship except Him. The angels and all those people who have been bestowed with the real knowledge also bear witness that Allah (SWT) alone is the Master and Creator of the whole universe and He is the upholder of equity and justice. He is All Mighty and Wise in all His commandments and decrees.

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ إِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَإِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿١٩﴾

(19) Surely the only Deen in the sight of Allah is Al-Islam. Those to whom the Book was given did not adopt ways different than this except out of envy among themselves, and after the true knowledge had come to them. They should know that Allah is swift in calling to account those who deny His revelations.

The Arabic word *"Deen"* is usually translated as religion but this is not a correct translation. Religion usually means a set of religious dogmas coupled with certain modes of worship and social customs. However the word religion, as understood presently, is not concerned at all with the politico-socio-economic system of the society. The word *"Deen"* on the other hand encompasses all the meanings of religion plus it also gives comprehensive rules for the formulation of a correct and just politico-socio-economic system. Allah (SWT) states in this *ayah* that the only *Deen* acceptable to Him is Islam i.e. the system of life given to us by Allah (SWT). Further He says: *"Those to whom the Book was given did not adopt ways different than this except out of envy among themselves, and after the true knowledge had come to them"* i.e. though the past nations were given guidance through Divine Books, which taught the only religion-Islam, some of them differed amongst themselves out of envy and because of the urge to dominate each other. Hence they distorted the beliefs and practices of the true faith and made it subservient to their own desires. *"They should know that Allah is swift in calling to account those who deny His revelations"* i.e. Allah (SWT) will punish those who reject His *ayaat* and He is swift in reckoning.

فَإِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْأُمِّيّٖنَ ءَأَسْلَمْتُمْ ۗ فَإِنْ أَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠﴾

(20) So if they argue with you, say: "I have surrendered my whole self to Allah (SWT) and so have those who follow me." Then ask those who are given the Book and those who are illiterates: "Will you also submit yourselves to Allah. If they do they shall be rightly guided but if they turn back, then your duty is only to convey the Message" (SWT)?

Allah (SWT) commands His Messenger (SAW) to proclaim that he and his followers have accepted the true religion and to ask the people of the Book and the disbelievers to completely surrender themselves to

the will of Allah and to accept the true *Deen.* If they accept, they have been guided to the true path, but if they reject, then it is not the responsibility of the Messenger to forcefully guide anyone; instead his duty is only to convey the message and it is Allah (SWT) who guides whomever He wills. *"Allah (SWT) is watching all His servants very closely"* i.e. He has perfect knowledge of everything and He knows those who are guided and those who stray from the true *Deen.*

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢١﴾

(21) Warn those who deny Allah's revelations, slay the Prophets without any justification, and kill those from among the people who enjoin justice about the news of a painful punishment.

This *ayah* refers to the People of the Book who were asked to acknowledge the Book of Allah (SWT) i.e. the *Qur'an* as the final authority and follow His Messengers but they denied His *ayaat* and His Messengers due to their deviance and refusal to follow them. This *ayah* also illustrates the rebellious attitude of the Jews towards their Prophets and the righteous people who enjoin justice and many of whom were killed without any justification. Allah (SWT) condemns them for their behavior and gives them the news of a painful and humiliating punishment.

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۖ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٢﴾

(22) They are the ones whose deeds will become void in this world and in the Hereafter. And they will have no helpers.

The Jews and the Christians were under the misconception that they would be rewarded for their good deeds in the next life but Allah says that if they do not accept the Prophet (SAW) as the last Prophet and refuse to believe in the *Qur'an* as the last and final book of Allah, all their good deeds will be futile and will only bring them disaster in this world and in the next. *"And they will have no helpers"* i.e. no one will be able to save them against the punishment of Allah (SWT).

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٣﴾

(23) Have you not seen the behavior of those who have been given a portion of the Book? When they are invited to settle their disputes according to the Book of Allah, some of them turn back and decline.

This refers to the Jews and the Christians who were given a portion of the *Book*. Allah's revelation as a whole throughout the ages is *Al-Kitab* (the Book). The *Torah* given to *Musa* (AS) and the *Injeel* given to *'Isa* (AS) are portions from that *Book*. Now when they are invited to the final revelation of Allah (SWT) and to follow His Last Messenger (SAW),

accepting whatever the Book judges to be right and rejecting whatever it judges to be wrong, they turn their backs away and pay no heed.

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢٤﴾

(24) *This is because they say: "The fire of Hell shall not touch us, but for a few days." And they are deceived in their religion by their own self-invented beliefs.*

As mentioned earlier in *ayah* 80 of *Al-Baqarah*, the Jews believed that the fire of Hell would not touch them except for a few days, and then they will be saved from it. This concocted belief has made them so bold and arrogant that they commit the gravest and most heinous crimes fearlessly, but they are deceiving no one but themselves because of this self-invented and false belief.

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۖ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٥﴾

(25) *How (will it be) when We gather them together on the Day about which there is no doubt, when every soul will be given what it has earned. And they will not be wronged.*

Allah (SWT) warns the Jews and the Christians to ponder on what will happen to them on the Day of Judgment, because they have defied Allah's commandments and killed His Prophets in this world. He will surely gather them on that day and will punish them because of their faults and false inventions in their religion. *"And they will not be wronged"* i.e. this punishment will only be because of their own evil deeds that they used to do in this world.

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۖ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٦﴾

(26) *Say: "O Allah! Lord of all dominion! You give dominion to whom You will and take away dominion from whom You will; You give honor to whom You will and You humiliate whom You will; in Your hand is all good. Surely You have power over everything."*

This is a very important prayer of the *Qur'an* in which a Muslim accepts Allah's absolute authority in all matters. Everything submits to the authority of the master of the universe, the absolute sovereign. All things in the universe have been created by Him and He gives a portion of this authority, power and wealth to whom He wills. He humiliates whom He wills and honors whom He pleases. He exalts whom He wills and abases whom He pleases. All that is good is in His domain and He has power over all things.

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۖ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۖ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾

(27) You cause the night to pass into the day and You cause the day to pass into the night. You raise the living from the dead and You raise the dead from the living. And You provide sustenance for anyone You wish without measure.

i.e. Allah (SWT) merges night into day and day into night. This entire cycle in which the long days and short nights progressively change into short days and long nights is due to the will of Allah (SWT). *"You raise the living from the dead and You raise the dead from the living."* The living are those who have attained faith and follow the right path, whereas the dead are those who disbelieve in Allah's commandments and are thus spiritually blind.

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝۲۸

(28) Let not the believers make unbelievers their friends rather than the believers; anyone who does so will have nothing to hope for from Allah - except if you do so as a precaution to guard yourselves against their tyranny. Allah warns you to fear Him: because with Allah is your final refuge.

In this *ayah*, Allah (SWT) prohibits the Muslims from taking the disbelievers as their friends and protectors in preference to the believers. And whosoever commits such acts, Allah (SWT) will never bestow His mercy upon them and will not help them in this world or in the Hereafter. However, if one is afraid of persecution, it is permissible to mingle with the disbelievers as much as is absolutely necessary. But true love and sincere friendship should only be reserved for the Muslims. One should take Allah (SWT) as one's helper and protector and be afraid of Him alone and bear in mind that towards Him is the final return.

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۹

(29) Say: "Whether you conceal what is in your heart or reveal it, it is known to Allah. He knows whatever is in the Heavens and whatever is in the Earth. Allah has full power over everything.

Nothing is hidden from Allah (SWT). He knows what is in the heavens and in the earth and is also aware of what we conceal and what we disclose. He even knows the intentions and thoughts of a person whether he reveals them or hides them. And *"Allah has full power over everything"* i.e. His comprehension and knowledge encompasses everything.

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْۗءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۳۰

Continued at page 78

داخلے جاری ہیں

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

رجوع الی القرآن کورسز (پارٹ I اور II)

یہ کورسز بنیادی طور پر تعلیم یافتہ افراد کے لیے ترتیب دیے گئے ہیں' تاکہ وہ حضرات جو کم از کم انٹرمیڈیٹ کی سطح تک اپنی دنیاوی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور اب بنیادی دینی تعلیم بالخصوص عربی زبان سیکھ کر فہم قرآن کے حصول کے خواہش مند ہوں' ان کورسز کے ذریعے ان کو ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر دی جائے۔ ہفتے میں پانچ دن روزانہ صبح کے اوقات میں تقریباً پانچ گھنٹے تدریس ہوگی۔ ہفتہ وار تعطیل ہفتہ اور اتوار کو ہوگی۔

نصاب (پارٹ I)

1. عربی صرف ونحو
2. ترجمۂ قرآن (تقریباً پانچ پارے)
3. آیاتِ قرآنی کی صرفی ونحوی تحلیل
4. قرآن حکیم کی فکری وعملی راہنمائی
5. تجوید وناظرہ
6. مطالعۂ حدیث
7. اصطلاحاتِ حدیث
8. اضافی محاضرات

نصاب (پارٹ II)

1. مکمل ترجمۃ القرآن (مع تفسیری توضیحات)
2. مجموعۂ حدیث
3. فقہ
4. اصولِ تفسیر
5. اصولِ حدیث
6. اصولِ فقہ
7. عقیدہ
8. عربی زبان وادب
9. اضافی محاضرات

- اس سال کلاسز کا آغاز 12 ستمبر سے ہوگا
- داخلہ کے خواہشمند خواتین وحضرات 12 ستمبر کو صبح ساڑھے آٹھ بجے انٹرویو کے لیے قرآن اکیڈمی تشریف لائیں
- پارٹ II میں خواتین کی شرکت کا انتظام نہیں ہے

نوٹ:
پارٹ I میں داخلے کے لیے انٹرمیڈیٹ پاس ہونا اور پارٹ II میں داخلے کے لیے رجوع الی القرآن کورس (پارٹ I) پاس کرنا لازمی ہے

برائے رابطہ: **قرآن اکیڈمی**

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: 3-35869501
email:irts@tanzeem. org

ندیم سہیل
0322-4371473
0312-4140589